

احمد یار خان

رات کا راز

جرم و سزا اور سراغ رسانی کی سچی کہانیاں



مکتبہ داستان

رات کا راز

پندرھواں مجموعہ

جرم وسزا اور سراغرسانی کی سچی کہانیاں

احمد یار خان

واحد تقسیم کار

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون :37352332، 37232336 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

فہرست

ایک قانون اور بھی ہے

لاش۔ لاش ۔ لاش ․․․․ سوائے لاش کے جیسے میرے دماغ میں کچھ رہا ہی نہیں۔ میں ارادہ کر رہا تھا کہ اب کسی کے قتل کی کہانی نہیں سناؤں گا۔ جُرم تو اور بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں لیکن اپنے عزیز دوست محبوب عالم کی کہانی ۔" لائن پر لاش"۔ (شمارہ اگست ۱۹۸۴ء) پڑھی تو ایک کیس یاد آ گیا۔ میں اس سے پہلے شاید ایک کہانی سُنا چکا ہوں۔ ایک خاوند نے اپنی بیوی کا گلا دبا کر اُس کی لاش ریلوے لائن پر رکھ دی تھی۔ اب ایک اور واردات یاد آ گئی ہے۔ میری ڈائری میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ یاد آئی تو یہ بھی یاد آ گیا کہ میرے کچھ پرانے کاغذات کہیں پڑے ہیں۔ ان میں اس واردات کی موٹی موٹی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ وہ کاغذات نکالے۔ جب یادوں کو تازہ کرنے لگا تو ایسے محسوس ہُوا جیسے میں واردات والے تھانے میں پہنچ گیا ہوں اور تفتیش کر رہا ہوں۔

زمانہ جنگِ عظیم کا تھا۔ اُس زمانے میں وارداتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دولت عام ہو گئی تھی۔ فوج میں لیفٹیننٹ کیپٹن بھی عام ہو گئے۔ بعض پُرانے صوبیداروں، جمعداروں (نائب صوبیداروں) کو انگریزوں نے لفٹیننی اور کپتانی کے عہدے دے دیئے۔ ٹھیکے داریاں اتنی زیادہ ہو گئیں کہ بعض معمولی سے آدمی مالدار ٹھیکیدار بن گئے۔ ان عہدوں اور چھپّر پھاڑ کر آنے والے پیسے نے ملک میں پرانی بیویوں کو طلاقیں دلائیں۔ بیس بائیس برس کی لڑکیوں کو عہدوں اور دولت کی خاطر چالیس پنتالیس اور پچاس برس کے افسروں یا ٹھیکیداروں

کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں نوجوان بیویوں کے اپنے آشناؤں
کے ساتھ بھاگنے کی، بوڑھے خاوندوں کے قتل کی، پرانی بیویوں کی مشکوک
حالات میں اموات کی اور کئی وارداتیں ہونے لگیں۔

فوج میں بھرتی عام ہو جانے کی وجہ سے کئی جرائم پیشہ لوگ بھی فوج
میں بھرتی ہو گئے تھے۔ یہ لوگ فوج کے رُعب سے وارداتیں کرتے تھے۔
ایسے بھی ہُوا کہ دو تین فوجی رات چھاؤنی سے نکل کر ڈکیتی کی واردات کر گئے
اور بارکوں میں چلے گئے۔ جرمنی اور جاپان کی جاسوسی ایک نیا جُرم تھا جو سامنے
آنے لگا۔ مختصر یہ کہ جنگِ عظیم نے جرائم میں اضافہ کر دیا تھا۔

اُس زمانے کا واقعہ ہے کہ مجھے دو سال ایسے علاقے کے تھانے میں
ایس ایچ او رہنا پڑا جہاں دھوکہ دہی کی معمولی سی وارداتوں سے لے کر
بیک وقت دو یا دو سے بھی زیادہ افراد کے قتل کی سنگین وارداتیں ہوتی ہی
رہتی تھیں۔ یہ تھانہ رشوت خوری کے لیے بھی مشہور تھا۔ یہ ایک قصبے میں
تھا۔ قصبہ خاصا بڑا تھا۔

ایک روز ایک رپورٹ آئی کہ ایک لڑکی عمر بیس اکیس سال، لاپتہ
ہو گئی ہے۔ رپورٹ دینے کے لیے جو آئے، ان میں لڑکی کا باپ تھا، لڑکی
کا خاوند اور لڑکی کا جوان بھائی تھا۔ میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ لڑکی کا
خاوند جس کی عمر پینتیس سال سے ذرا زیادہ ہی تھی، سُوٹ بوٹ میں تھا۔ اُس
نے شوخ رنگ کی ٹائی باندھ رکھی تھی۔ اُس کے مقابلے میں لڑکی کا باپ اور بھائی
نہایت معمولی کپڑوں میں تھے۔ خاوند جسے سجاد کہہ لیں، بڑھ بڑھ کر باتیں کرتا
تھا۔ لڑکی کا باپ اور بھائی بولتے ہی نہیں تھے۔ اگر ذرا سا بولتے تھے تو
صاف پتہ چلتا تھا کہ ڈرے ہوئے ہیں۔

خاوند کی شکل وصورت اور رنگ رُوپ اتنا اچھا نہیں تھا جتنے
اچھے اُس نے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس نے بتایا کہ اس لڑکی کے ساتھ
اُس نے ڈیڑھ سال پہلے شادی کی تھی۔ اُس نے لڑکی کا نام بتایا۔ میں اُس کا
نام خدیجہ لکھوں گا۔ سجاد نے مجھے اُس کا فوٹو دکھایا۔ خدیجہ بہت خوبصورت

لڑکی تھی۔ اُس کی مُسکراہٹ اتنی شوخ تھی جیسے وہ ابھی ہنس پڑے گی۔
مجھے بتایا گیا کہ خدیجہ اپنے خاوند سجاد کے گھر سے لاپتہ ہوئی ہے۔
میرے پوچھنے پر سجاد نے بتایا کہ اُس کے گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ کوئی
نوکر بھی نہیں تھا۔ رات کو وہ معمول کے مطابق سوئی۔ صبح سجاد کی آنکھ کھلی
تو خدیجہ پلنگ پر نہیں تھی۔ اُس نے سارے گھر میں دیکھا، پھر خدیجہ کے
ماں باپ کے گھر گیا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔

یہ میرے لیے کوئی نیا کیس نہیں تھا۔ نوجوان بیوی کا ادھیڑ عمر خاوند
کے گھر سے لاپتہ ہو جانا کوئی عجیب و غریب واقعہ نہیں تھا۔ عمر کے علاوہ
خدیجہ کی گمشدگی کی ایک وجہ اور بھی مجھے نظر آ رہی تھی۔ اگر خدیجہ واقعی اتنی
خوبصورت تھی جتنی فوٹو میں لگتی تھی تو خدیجہ اور سجاد کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ مجھے
یقین سا ہو رہا تھا کہ خدیجہ اغوا نہیں ہوئی، وہ بھاگ گئی ہے۔ مجھے رپورٹ
درج کرنی تھی لیکن اس سے پہلے یہ یقین کر لینا ضروری سمجھا کہ لڑکی اغوا نہیں
ہوئی۔ اگر وہ بھاگ گئی تھی تو بھی جُرم تھا۔ وہ سجاد کی بیوی تھی۔ میں نے سجاد کو
اپنے پاس بیٹھا رہنے دیا اور خدیجہ کے باپ اور بھائی سے کہا کہ وہ باہر بیٹھیں۔

لڑکی بدچلن تھی؟

میں نے سجاد سے وہ تمام باتیں پوچھیں جو اس قسم کے کیس میں
تھانیدار پوچھا کرتے ہیں۔ مجھے یہ معلومات ملیں کہ سجاد کا کوئی ایسا دشمن
نہیں جو اُس کی بیوی کو غائب کر دے۔ اُس نے کسی پر شک نہ کیا۔ خدیجہ
اُس کی تیسری بیوی تھی۔ اس کی پہلی شادی اُس وقت ہوئی جب اس کی
عمر بائیس تئیس سال تھی۔ نو دس سال بعد اُس نے بیوی کو طلاق دے
دی تھی۔ چھ سات ماہ بعد اُس نے اسی قصبے سے اپنی برادری میں سے ایک
نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کی۔ دو ڈھائی سال بعد یہ لڑکی مر گئی۔ اس کے
بعد اُس نے خدیجہ کے ساتھ شادی کی۔

"کیا آپ کو اغوا کا شک ہے؟" ... میں نے سجاد سے پوچھا ... "یا آپ

یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی بیوی گھر سے بھاگ گئی ہے، یا آپ یہ رپورٹ لکھوانا چاہتے ہیں کہ آپ کی بیوی لاپتہ ہوگئی ہے؟"

وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس پر میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ وہ اطمینان سے سوچ لے۔

"ملک صاحب!" — اُس نے آہ بھر کر کہا — "میں رپورٹ لکھوانا ہی نہیں چاہتا۔ ایسی جرأت تو کوئی نہیں کرسکتا کہ اُسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہو۔ وہ بدچلن لڑکی نہیں تھی ..... اور سچی بات یہ ہے جی، وہ شریف لڑکی بھی نہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ وہ کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

"اگر آپ رپورٹ نہیں لکھوانا چاہتے تو مجھے آپ سے کچھ بھی نہیں پوچھنا چاہیے" — میں نے کہا — "لیکن آپ باتیں ایسی کر رہے ہیں جنہیں میں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ وہ آپ کی بیوی ہے۔ اگر آپ کو اُس کے لاپتہ ہونے کی پروا نہیں، تو جس کی وہ بیٹی اور جس کی بہن ہے، وہ بھی آپ کے ساتھ آئے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے تو نہیں کہیں گے کہ وہ رپورٹ نہیں لکھوانا چاہتے۔ میں اُن سے بات کیے بغیر انہیں تھانے سے رخصت نہیں کروں گا۔"

"ملک صاحب!" — اُس نے دوستانہ انداز میں کہا — "یہ غریب لوگ ہیں، میں انہیں کچھ رقم دے کر اُن کا منہ بند کردوں گا۔"

"کیوں جناب؟" — میں نے پوچھا — "ان کا منہ بند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اپنے خلاف شک پیدا کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے ساتھ آپ جو باتیں بھی کریں گے وہ آپ کے خلاف بھی جاسکتی ہیں۔ ذرا سوچ کر بات کریں۔"

"شک شبے والی کوئی بات نہیں ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "میں اپنی نیکی کی سزا بھگت رہا ہوں۔ یہ غریب لوگ ہیں۔ مجھے بیوی کی ضرورت تھی۔ ان کی یہ بیٹی مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے ان سے رشتہ مانگا تو انہوں نے دے دیا۔

مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے ایسی لڑکی کو جسے ہفتے میں شاید ایک بار گوشت میسر آتا ہوگا، شہزادی بنا دیا۔ ایسے کپڑے اُس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے جو میں نے اُسے پہناتے۔ اُس کا پرس نوٹوں سے بھرا رہتا تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی کا دماغ خراب ہوگیا۔ میں افسروں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والا شخص ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ لڑکی میری حیثیت کو سمجھ کر اپنے طور طریقے اس کے مطابق کرلے، لیکن یہ پہلے سے زیادہ اُجڈ ہوگئی .....

"ٹھیکیداری کے سلسلے میں مجھے زیادہ مصروف رہنا پڑتا ہے۔ باہر بھی جانا پڑتا ہے۔ اس لڑکی کو میں نے پوری آزادی دے رکھی تھی لیکن اس نے اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ میری آمدنی سے اپنے ماں باپ کا گھر بھرتی رہی۔ مجھے اُس کے چال چلن پر بھی شبہ ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ دن بدن میرے ہاتھ سے نکلتی گئی بلکہ میرے دماغ پر سوار ہونے لگی۔"

اُس شخص نے اپنی لاپتہ بیوی کے خلاف بہت سی باتیں مجھے سنائیں اور اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اسے طلاق دینا چاہتا تھا لیکن اسے

اُن لوگوں کی غربت پر رحم آگیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ بدچلن تھی تو اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے تعلقات کس کے ساتھ تھے؟ وہ اس کا نام بتائے۔

"میں تو کہتا ہوں کہ خدا نے میرے حال پر رحم کیا ہے کہ وہ خود ہی چلی گئی ہے" — سجاد نے کہا — "اور میں طلاق دینے کے گناہ سے بچ گیا ہوں۔ میں آج ہی طلاق لکھ کر اس کے ماں باپ کو دے دوں گا۔"

یہ صورت میرے لیے اطمینان کا باعث تھی کہ سجاد اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھوا رہا تھا لیکن لاپتہ لڑکی کے باپ کا ارادہ معلوم کرنا میرے لیے بہت ضروری تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ میں سجاد کی بات مان کر خدیجہ کے باپ اور بھائی کی بات نہ سنتا تو وہ لوگ اوپر درخواست دے دیتے کہ میں

نے رشوت لے کر اُن کی گمشدہ لڑکی کی رپورٹ نہیں لکھی۔ اُن کی بات
سُننا اس لیے بھی ضروری تھا کہ سجّاد نے اپنے خلاف میرے دل میں کچھ
شک پیدا کر دیا تھا۔ میں نے سجّاد کو باہر بھیج دیا اور خدیجہ کے باپ کو
بلایا۔ اُس کے چہرے پر غم بھی تھا لیکن خوف کی جھلک بڑی صاف تھی۔ میرے
پُوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ ایک پرائمری سکول میں ٹیچر ہے۔

"کیا آپ اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانا چاہتے ہیں؟" ——
میں نے پوچھا۔

بوڑھے باپ نے کچھ دیر تو میرے مُنہ کی طرف دیکھا اور پھر دائیں
اور پھر بائیں دیکھا۔

"میرے پاس بیٹھ کر آپ کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں" —— میں
نے کہا —— "اب آپ جو کچھ کہیں گے، وہ میں آپ کے داماد کو نہیں
بتاؤں گا۔"

"سجّاد صاحب نے کیا کہا ہے؟" —— اُس نے پوچھا۔

میں نے اُسے بتا دیا کہ اُس کا داماد رپورٹ نہیں لکھوانا چاہتا اور وہ
کہتا ہے کہ لڑکی بدچلن تھی، اچھا ہُوا کہ خود ہی چلی گئی ہے۔ میں نے خدیجہ
کے باپ کو یہ بھی بتا دیا کہ سجّاد نے کہا ہے کہ وہ اس کی بیٹی کو طلاق دے
دے گا۔ میری یہ بات سُن کر خدیجہ کے باپ کی آنکھوں سے آنسو گرنے
لگے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دے کہ وہ رپورٹ لکھوانا چاہتا
ہے یا نہیں۔

"میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا" —— اُس نے کہا —— "میں اپنی بیوی
سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ یہ شخص بھی رپورٹ لکھوانے کے حق میں نہیں
لیکن مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی سنگین واردات پر مٹی ڈالی جا رہی ہے۔
میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے ایک دو روز بعد یہ واردات میرے سامنے
آجائے اور اُس وقت تفتیش میرے لیے مشکل ہو جائے تو کیوں نہ میں ان

لوگوں سے ایسی باتیں پُوچھ لوں جو پس منظر کے طور پر اپنے ذہن میں محفوظ
رکھ سکوں۔ اپنی سوچ کے پیشِ نظر میں نے خدیجہ کے باپ سے پوچھا کہ
اپنی بیٹی کی گمشدگی کے متعلق اُس کی کیا رائے ہے اور اُس کے ذہن
میں کیا شک پیدا ہُوا ہے۔

"شک تو کئی ہیں حضور!" —— اُس نے کہا —— "لیکن میں اتنا
غریب آدمی ہوں کہ کسی سے ٹکر نہیں لے سکتا۔"

"ٹکر سے آپ کی کیا مراد ہے؟" —— میں نے پوچھا —— "کیا آپ
کو اپنے داماد کے خلاف کوئی شک ہے؟ ..... اگر آپ اپنی بیوی کے
ساتھ صلاح مشورہ کرنا چاہتے ہیں تو اپنے بیٹے کو بھیج کر بیوی کو یہاں
بُلا لیں۔"

وہ کچھ پس و پیش کر رہا تھا۔ مجھے اپنے طور پر احتیاط اور کسی آنے
والی مصیبت کی پیش بندی کرنی تھی۔ میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس شخص کے
دل میں اپنے داماد کے خلاف کوئی نہ کوئی شک ضرور ہے۔ مجھے کئی اور
باتیں کرنی پڑیں۔ آخر وہ اپنی بیوی کو بلانے پر رضامند ہو گیا۔

"کس کا بچہ چاہیئے؟"

جب خدیجہ کی ماں تھانے میں آئی، اُس وقت تک میں نے خدیجہ
کے باپ سے بہت سی باتیں معلوم کر لی تھیں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ سجّاد
معمولی سا دکاندار ہُوا کرتا تھا۔ آدمی چالاک تھا۔ مِل مِلا کر اس نے فوج کو مال
سپلائی کرنے کے ٹھیکے لینے شروع کر دیئے۔ چھاؤنی جو خاصا بڑا شہر تھا، قصبے
سے پچیس چھبیس میل دُور تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سجّاد سپلائر اور ملٹری کنٹریکٹر
بن گیا۔ اس کی تمام برادری درمیانے درجے سے بھی ایک دو درجے نیچے
تھی۔ اُس نے خدیجہ کو دیکھا تو اس کا رشتہ مانگ لیا۔ ماں باپ نے
خدیجہ کا رشتہ اس لالچ میں دے دیا کہ سجّاد روپے پیسے والا ہے اس

لیے بیٹی سُکھی رہے گی لیکن بیٹی سُکھی نہ رہ سکی۔

خدیجہ کے باپ نے مجھے بتایا کہ خدیجہ کو خاوند کے خلاف کیا کیا شکایتیں تھیں۔ میں نے اس شخص کی زبانی وہ شکایتیں سُن لیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ بیٹیاں جو باتیں اپنی ماؤں کے ساتھ کیا کرتی ہیں وہ باپوں کے ساتھ نہیں کرتیں۔ یہ صحیح ہے کہ مائیں اپنی بیٹیوں کی رازدار ہُوا کرتی ہیں۔ میں نے باپ کو باہر بھیج کر خدیجہ کی ماں کو بُلایا۔ اُس سے پوچھا کہ اپنی بیٹی کی گمشدگی کے متعلق اُس کے دل میں کیا کیا خیال آتے ہیں۔

اس عورت نے پہلی بات یہ کہی کہ میں سجّاد کو پتہ نہ چلنے دوں کہ اُس نے میرے ساتھ کیا باتیں کی ہیں۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں سجّاد کو کچھ بھی پتہ نہیں چلنے دوں گا۔

وہ ماں تھی۔ روتی تھی اور مجھے سناتی تھی کہ اُس کی بیٹی کی ازدواجی زندگی کیسی گذر رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ سجّاد کی پہلی بیوی بھی اُس سے مطمئن اور خوش نہیں تھی۔ اس عورت کو سجّاد سے نہ ذہنی سکون حاصل تھا نہ جسمانی۔ اُس کا ایک بھی بچّہ نہ ہُوا۔ اُسے سجّاد نے اس لیے طلاق دی کہ سجّاد ٹھیکیدار اور سپلائر بن گیا اور روپے پیسے کی ریل پیل ہوگئی تھی۔ یہ شخص عیّاش ہوگیا تھا۔ اب اُسے نئی بیوی کی ضرورت تھی۔ اس نے پہلی بیوی کو طلاق دی اور نئی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ بھی خوش نہ رہی۔ پہلی خاموشی سے برداشت کرتی رہی، نئی نے لڑائی جھگڑے شروع کر دیئے۔ مُنہ آئی بات کہہ گذرتی تھی۔

ایک روز وہ مر گئی۔ اُس کے ماں باپ امیر نہیں تھے۔ ایک بات اُڑی تھی کہ یہ لڑکی کسی بیماری سے نہیں مری، اُسے زہر دیا گیا تھا۔ سجّاد نے اُس کی میّت اُس کے ماں باپ کو نہیں دی تھی۔ وہ جس روز مری، اُسی روز اُسے دفن کر دیا گیا۔ لوگوں نے چند روز باتیں کیں پھر سب بھول گئے۔

اس کے بعد خدیجہ کے باپ نے سجّاد سے کچھ رقم وصول کر لی اور خدیجہ کو سجّاد کے ساتھ بیاہ دیا۔ ماں اس خیال سے رضامند ہوگئی کہ بیٹی ہر

لحاظ سے آرام اور سکون میں رہے گی۔ روپے پیسے کے علاوہ سجّاد کے گھر میں ماں کو یہ خوبی نظر آئی تھی کہ سجّاد اکیلا رہتا تھا۔ اُس نے اپنے ماں باپ کو الگ ایک چھوٹے سے مکان میں رکھا ہُوا تھا۔

خدیجہ کی ماں نے مجھے بتایا کہ خدیجہ کچھ زیادہ ہی خوبصورت نکلی۔ اُس میں سادگی تھی۔ یہ لوگ غریب تو تھے لیکن اتنے غریب نہیں تھے کہ اپنی ضروریات پوری نہ کر سکتے۔ خدیجہ نوجوان لڑکیوں کی طرح اگر قیمتی نہیں تو اچھّے کپڑے پہن سکتی تھی لیکن معمولی اور سادہ کپڑے پہنتی تھی۔ آنکھوں میں سُرمہ کاجل بھی نہیں لگاتی تھی۔ ہنسنے کھیلنے اور ناچنے کودنے کی عادی تھی۔ مذاق کرتی اور دوسروں کے مذاق سے لطف اُٹھاتی تھی۔ مُنہ میں جو آئے کہہ دیتی تھی۔ اُس کی کسی بھی بات کو کوئی بُرا نہیں سمجھتا تھا۔

شادی کے بعد خدیجہ نے ایسی شکایت کبھی نہیں کی تھی کہ اُسے ایسے شخص کے ساتھ بیاہ دیا گیا ہے جو اُس سے سولہ سترہ سال بڑا ہے۔ وہ یہ شکایت کرتی تھی کہ سجّاد اُسے اپنے قدرتی رنگ میں نہیں رہنے دیتا۔ اُسے کہتا تھا کہ میک اَپ میں رہا کرو۔ ماں نے ایک اور بات بتائی۔ بیٹیاں ایسی باتیں اپنی ماؤں کو بتا دیا کرتی ہیں۔ خدیجہ جسمانی لحاظ سے سجّاد سے مطمئن نہیں تھی۔ اُس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ سجّاد کو شرمسار کرتی اور اس کا مذاق بھی اڑاتی تھی۔ ایک روز سجّاد نے خدیجہ سے کہا کہ مجھے پہلی دو بیویوں نے بچّہ نہیں دیا، تم ایک بچّہ پیدا کر دو۔ خدیجہ نے ہنس کر اُسے کہا —— "آپ سے تو میرا بچّہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر اجازت دیں تو میں آپ کو بچّہ دینے کا کوئی اور بندوبست کر سکتی ہوں"۔

ماں نے خدیجہ کو منع کیا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ ایسی بکواس نہ کیا کرے، لیکن خدیجہ کی عادت ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ کسی سے ڈرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ سجّاد نے خدیجہ کے ماں باپ سے کئی بار شکایت کی تھی کہ خدیجہ اُس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی اور ذرا ذرا سی بات پر غصّے میں آجاتی ہے۔

ماں نے ایسی ہی کچھ اور باتیں سنائیں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ چاہتی ہے کہ میں اس کی بیٹی کے لاپتہ ہونے کی رپورٹ لکھ لوں اور خدیجہ کے خاوند کو مشتبہ بٹھاؤں کہ اس نے لڑکی کو غائب کر دیا یا قتل کر دیا ہے؟

وہ اپنے خاوند کے ساتھ مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اُس کے خاوند، اُس کے بیٹے اور سجاد کو اندر بلایا اور انہیں کہا کہ وہ فیصلہ کر کے مجھے بتائیں کہ لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوں یا نہ لکھوں۔

"دراصل یہ (خدیجہ کا باپ اور ماں) ضد کر رہے تھے کہ تھانے رپورٹ کرنی چاہیے" ——— سجاد نے کہا ——— "میں نے انہیں کہا تھا کہ چلو چلتے ہیں لیکن اس سے یہ ہوگا کہ ساری دنیا کو پتہ چل جائے گا کہ ان کی بیٹی خاوند کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ میں انہیں پھر......"

"میں صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم رپورٹ لکھوانا چاہتے ہو یا نہیں" ——— میں نے پوچھا۔

خدیجہ کے باپ نے سجاد کی طرف دیکھا۔ سجاد نے شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر دیا کہ باپ نے میری طرف دیکھ کر سر ہلا دیا کہ وہ کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔ خدیجہ کی ماں اور اُس کا بھائی خاموش رہے۔ سجاد انہیں باہر لے گیا۔ سجاد مجھے شریف آدمی نظر نہیں آتا تھا، لیکن میں کسی کو مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ضرور رپورٹ لکھوائیں۔

وہ سب چلے گئے، پھر واپس نہ آئے۔

بھائی قتل ہو گیا

ایک مہینہ اور کچھ دن گزر گئے۔ سجاد اور خدیجہ میرے ذہن سے اُتر گئے تھے۔ صبح سویرے ابھی میں اپنے گھر میں تھا کہ ایک کانسٹیبل

نے آکر بتایا کہ شہر کا ایک ٹھیکیدار آیا ہے۔ اُس کا بھائی قتل ہو گیا ہے۔ کانسٹیبل نے اس کا نام سجاد بتایا تو بھی مجھے یاد نہ آیا کہ سجاد کے ساتھ میری ملاقات ہو چکی ہے۔ میں جلدی جلدی وردی پہن کر تھانے میں آیا تو سجاد کو دیکھ کر یاد آگیا کہ اس کی بیوی لاپتہ ہو گئی تھی۔

"ملک صاحب!" ——— اُس نے مغموم آواز میں کہا ——— "میرا چھوٹا بھائی قتل ہو گیا ہے"۔

"بیوی کا کچھ پتہ چلا تھا؟" ——— میں نے پوچھا۔

"نام نہ لیں اُس کا ملک صاحب!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "میں نے اُس کے ماں باپ کو دو ہزار روپیہ دے دیا تھا...... میرا بھائی قتل ہو گیا ہے"۔

"کس طرح؟"

اُس نے بھائی کا نام لے کر کہا ——— "کل میں وہاں چلا گیا تھا۔ بل وصول کرنے تھے۔ رات وہیں رہنا تھا۔ میرے گھر میں اور کوئی نہیں۔ گھر میں رقم بھی ہے اور زیورات بھی۔ گھر کو تالا لگا کر جانا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ رات کو میرے گھر میں سوئے۔ میں چلا گیا۔ آج صبح واپس آیا تو دروازہ کھلا تھا۔ اندر گیا تو پلنگ پر بھائی کی لاش پڑی تھی.... اُس کے سینے میں چاقو مارے گئے ہیں"۔

میرا ذہن فوراً مہینہ ڈیڑھ مہینہ پیچھے چلا گیا جب یہ شخص میرے پاس اپنی بیوی کے لاپتہ ہونے کی اطلاع لایا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو شاباش دی کہ یہ لوگ گمشدگی کی رپورٹ نہ لکھوانے کا فیصلہ کر چکے تھے، پھر بھی میں نے ان کی فیملی بیک گراؤنڈ معلوم کر لی تھی۔ سب سے پہلا اور پختہ شک جو میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ قتل کی یہ واردات خدیجہ نے کرائی ہے۔ خدیجہ کے جو اوصاف مجھے اُس وقت سنائے گئے تھے اور جس قسم کے آدمی سے اُس کی شادی کر دی گئی تھی، یہ اوصاف اور یہ حالات اُسے قتل پر اُکسا سکتے تھے۔ سوچنے والی بات یہ تھی کہ سجاد کا بھائی کیوں قتل ہوا۔ میری سمجھ میں یہ بات

ائی کہ اپنے بھائی کے بعد سجاد قتل ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خدیجہ کا تعلق سجاد کے بھائی کے ساتھ ہی ہو اور وہ اسی سلسلے میں مارا گیا ہو۔ بہرحال یہ شکوک و شبہات تھے جو فوری طور پر میرے ذہن میں آئے۔ سب سے پہلے تو مجھے وہاں جانا تھا جہاں مقتول کی لاش پڑی تھی۔

"کیا آپ نے خدیجہ کو طلاق دے دی تھی؟" —— میں نے سجاد سے پوچھا۔

"نہ جی" —— اُس نے جواب دیا —— "میں نے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن خدیجہ کے بھائی نے میرے ساتھ ایسی باتیں کیں کہ مجھے یہ کہنا پڑا کہ جاؤ میں طلاق نہیں دیتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری بہن جس کسی کے ساتھ گئی ہے اُس کے ساتھ شادی کس طرح کرے گی!"

"کیا آپ اس قسم کا شک کریں گے کہ آپ کے بھائی کو خدیجہ کے بھائی نے قتل کرایا ہے؟"

"توبہ کرو جی" —— سجاد نے بڑی رعونت سے جواب دیا —— "ان لوگوں میں اتنی جرأت ہوتی تو اپنی بیٹی کے لاپتہ ہونے پر میری جان کو آجاتے۔ خدیجہ کے بھائی نے مجھے کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ وہ مجھے سارے شہر میں بدنام کر دے گا۔ میں نے ان لوگوں کو اچھی خاصی رقم دے دی تھی۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے مجھے بدنام کیا۔ میں نے ان کے خلاف یہ انتقامی کارروائی کی کہ ان کی بیٹی کو طلاق نہ دی!"

"سجاد بھائی!" —— میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "آپ کی انتقامی کارروائی اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ خدیجہ کی انتقامی کارروائی دیکھ لو۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ سنبھل کر رہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ آپ کے بھائی کے بعد آپ کی باری ہے۔"

اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ مجھے ایسے تین چار کیس یاد آ گئے جن میں ایک تو میرا اپنا کیس تھا۔ ان میں بالکل ایسے ہوا کہ بیوی خاوند کو چھوڑ کر بھاگ گئی اور کسی بہت بڑے بدمعاش یا کسی نامی گرامی ڈاکو کے پاس اپنی مرضی سے یا کسی کے ذریعے پہنچ گئی۔ ان خاوندوں کے ساتھ یوں ہوا کہ

کسی کے گھر ڈاکہ پڑا اور کوئی قتل ہو گیا۔

"خدیجہ کا پتہ چلا کہ کہاں ہے وہ؟" —— میں نے سجاد سے پوچھا۔

"میں نے پتہ چلانے کی کوشش ہی نہیں کی" —— اُس نے جواب دیا —— "جس انسان کو دل سے اُتار دیا اُس کا پیچھا کیا کرنا۔"

میں اپنی ضرورت کے سٹاف کو ساتھ لے کر سجاد کے ساتھ اُس کے گھر چلا گیا۔ یہ مکان پُرانے زمانے کی حویلیوں اور چوباروں کی طرز کا بنا ہوا تھا۔ اسے مرمت کرا کے ٹیپ ٹاپ کی گئی تھی۔ گلی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ دو عورتیں مکان کے دروازے میں بیٹھی بین کر رہی تھیں۔ ایک بہت بوڑھی تھی۔ وہ سجاد اور مقتول کی ماں تھی۔ دوسری جوان لڑکی تھی۔ وہ مقتول کی بیوی تھی۔ مقتول کا باپ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ سجاد مجھے اُس کمرے میں لے گیا جس میں لاش پڑی تھی۔ صاف ستھرا کمرہ تھا۔ کشادہ بھی تھا۔ دیواروں کے ساتھ رنگین تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ دو پلنگ ملے ہوئے بچھے تھے۔ پلنگ پوش پھولدار اور قیمتی کپڑے کا تھا۔ ایک پلنگ پر لاش پڑی تھی۔ پلنگ پوش کی حالت بتاتی تھی کہ مقتول تڑپتا رہا ہے۔ خون دونوں دونوں پلنگوں پر بکھرا ہوا تھا۔ لاش پیٹھ کے بل تھی۔ مقتول کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی۔

میں نے لاش کی قمیض سامنے سے پھاڑ ڈالی۔ خون جم گیا تھا۔ نیچے والی پسلیوں میں چھری، چاقو یا خنجر کے تین گہرے زخم تھے۔ یہ دل کے مقام کے قریب تھے۔ ان کے علاوہ اور کوئی زخم نہیں تھا۔ میں نے لاش کی برآمدگی کے لیے دو گواہ باہر سے بلائے۔ ہیڈ کانسٹیبل کو بھی بلایا اور اُسے کہا کہ کاغذی کارروائی مکمل کرے اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائے۔

مجھے سب سے پہلے یہ دیکھنا تھا کہ قاتل کس طرف سے اندر آئے۔ میں نے سجاد سے پوچھا کہ ایسا کوئی آسان راستہ ہو سکتا ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ رات گھر نہیں تھا۔ پچیس چھبیس میل دُور چھاؤنی والے شہر میں تھا۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے واپس آیا۔ باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اُس نے اندر آ کر دیکھا تو بھائی خون میں ڈوبا پڑا تھا۔ مقتول شاید دروازہ بند کرنا

بھول گیا تھا۔

میں نے باہر کا دروازہ دیکھا۔ کواڑ بند کیے۔ ایک چٹخنی اُوپر تھی اور ایک زنجیر درمیان میں تھی جو ایک کواڑ کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ یہ دوسرے کواڑ کے ساتھ چڑھتی تھی۔ میں نے چٹخنی چڑھائی اور زنجیر بھی لگادی۔ میں دیکھنے ہی لگا تھا کہ یہ دونوں باہر سے کسی طرح کھل سکتی ہیں؟ سجاد نے میرے پوچھے بغیر بتا دیا کہ چٹخنی کا بھروسہ نہیں۔ میں نے دیکھا چٹخنی کو گرنے سے روکنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ وہاں سے چٹخنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کواڑ کو اندر ذرا سا دبانے سے یا باہر سے ذرا سا کھینچنے سے چٹخنی گر پڑتی تھی اور کواڑ ذرا سے اندر کی طرف ہو جاتے تھے۔ اس طرح کواڑوں کی پوزیشن یہ ہو جاتی تھی کہ ایک کواڑ کو اندر اور دوسرے کو باہر دباؤ تو درمیان میں اتنا خلا ہو جاتا تھا جس میں قلم جتنی موٹی اور لمبی چیز ڈال کر زنجیر اُتاری جا سکتی تھی۔

"میری جب بیوی ہوتی تھی اور مجھے رات دیر سے گھر آنا ہوتا تھا تو میں بیوی سے کہا کرتا تھا کہ وہ چٹخنی اور زنجیر چڑھا لے" ـــــ سجاد نے کہا ـــ "وہ سو جاتی تھی۔ میں آکر کواڑ اس طرح کھول لیا کرتا تھا۔"

اُس نے کواڑ باہر سے کھول کر دکھاتے۔ زنجیر اُتارنے کے لیے اُس نے اپنا فونٹین پین استعمال کیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ جب رات کو گھر ہوتا تھا تو زنجیر کے کُنڈے میں ایک موٹا کیل ڈال دیا کرتا تھا جو بولٹ کی شکل کا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ اپنے بھائی کو بتانا بھول گیا تھا کہ زنجیر کے کُنڈے میں یہ کیل ڈال کر سوئے۔

"کیا آپ کی ہر بیوی کو معلوم تھا کہ زنجیر اور چٹخنی باہر سے کھولی جا سکتی ہیں؟"

"تینوں کو معلوم تھا۔"

"خدیجہ کو بھی؟"

"جی!" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "اُسے بھی معلوم تھا۔"

میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ دیکھ چکا ہے کہ گھر میں چوری نہیں ہوئی۔ اُس روز گھر میں کیش زیادہ رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے بل ادا کرنے تھے۔ زیور بھی تھا۔ رقم اور زیور جہاں رکھے تھے وہیں پڑے تھے۔

"خدیجہ کا زیور آپ نے اُس کے ماں باپ کو واپس کر دیا ہوگا" ـــ میں نے کہا۔

"میں نے اُنہیں نقد رقم دے دی تھی" ـــ سجاد نے کہا۔

"پھر آپ نے اُن پر احسان کیا کیا ہے؟" ـــ میں نے کہا ـــ "اُن کا زیور ہضم کر لیا اور رقم دے دی۔"

وہ چپ رہا۔ خدیجہ میرے ذہن میں اٹک گئی تھی۔ میری پولیس والی فالتو حس یہی کہتی تھی کہ قتل خدیجہ نے کرایا ہے لیکن میرا شک یہ دیکھ کر متزلزل ہو جاتا تھا کہ سجاد کی جگہ اُس کا بھائی قتل ہوا تھا۔ اگر یہ واردات خدیجہ نے کرائی ہوتی تو وہ اس گھر سے روپیہ پیسہ اور زیور بھی نکلوا لیتی۔

جتنی خوبصورت اتنی زہریلی

میں نے سجاد کی بیٹھک میں ہی تفتیش شروع کر دی۔ سب سے پہلے اُسی کا بیان لینا ضروری تھا۔ اُس نے بیان دیا اور میں نے کچھ جرح کی اور کئی ایک باتیں جو تفتیش میں میرے کام آ سکتی تھیں پوچھیں۔ میں نے خاص طور پر پوچھا کہ مقتول کی دشمنی کس کے ساتھ تھی ـ سجاد نے بتایا کہ مقتول اتنا بھلا آدمی تھا کہ اُس کی دشمنی کسی کے ساتھ بھی نہیں تھی۔ وہ دشمنی رکھنے والا آدمی تھا ہی نہیں۔

سجاد سے پوچھ گچھ کے دوران پتہ چلا کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنے بھائی کو اپنی غیر حاضری میں اپنے گھر سُلایا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا کہ اُس رات رقم ذرا زیادہ تھی۔ اس سے پہلے وہ جب کبھی رات کے لیے غیر حاضر ہوتا تھا تو اپنے ایک نوکر کو

گھر میں چھوڑ جاتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ مقتول کی دشمنی کا کوئی اشارہ مل جائے لیکن نہ ملا۔ میں نے بہتر یہ سمجھا کہ میرے جو اپنے آدمی ہیں ان سے معلوم کروں گا کہ اس قتل کا باعث کیا ہو سکتا ہے۔ نمبردار اور دو سفید پوش وہاں موجود تھے۔ میں نے سجاد کو باہر بھیج کر نمبردار کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ اس خاندان اور برادری کے ایسے کیا حالات ہیں کہ معاملہ قتل تک پہنچ گیا ہے

"مقتول ہر لحاظ سے شریف آدمی تھا ملک صاحب!" — نمبردار نے کہا — "میں خود حیران ہوں کہ اس سیدھے سادے اور بھولے بھالے آدمی کو کس نے قتل کیا ہے اور کیوں کیا ہے۔ میں اس پر بھی حیران ہوں کہ مقتول اپنے بڑے بھائی کے گھر میں سویا کیوں تھا۔ دونوں بھائیوں کی آپس میں سخت ناراضگی تھی۔ ان کے درمیان جائیداد کا بھی جھگڑا تھا....

"صبح جب مجھے اطلاع ملی کہ مقتول اپنے بھائی کے گھر میں قتل ہو گیا ہے تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اسے بڑے بھائی نے قتل کیا ہے۔ اگر سجاد قتل ہو جاتا تو میں آپ کو کئی وجوہات بتا سکتا تھا کیونکہ یہ آدمی ہی ایسا ہے۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ سجاد کی دوسری بیوی مشکوک حالت میں مری تھی؟"

"جن عورتوں نے میت دیکھی تھی وہ کہتی تھیں کہ میت کا رنگ نیلا ہوتا جا رہا تھا" — نمبردار نے کہا — "لڑکی والے کمزور لوگ تھے۔ بیچارے خاموش رہے۔ میرا شک سجاد پر ہے۔ یہ بڑا کمینہ آدمی ہے۔ اسے ٹھیکے تو مال سپلائی کرنے کے ملتے ہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ جہاں سے اسے ٹھیکے ملتے ہیں وہاں یہ شہر کی طوائفیں بھی سپلائی کرتا ہے۔"

"ڈیڑھ ایک مہینہ ہوا، میں نے سنا تھا کہ اس کی تیسری بیوی لاپتہ ہو گئی ہے" — میں نے کہا — "تمہارا کیا خیال ہے وہ

کہاں گئی ہو گی؟"

"میرا خیال ہے کہ اس شخص نے خود ہی اسے زندہ یا مردہ غائب کر دیا ہے" — نمبردار نے جواب دیا — "یہ تو اس لڑکی کے ماں باپ تھے جنہوں نے اسے سجاد سے روپیہ پیسہ لے کر اس کی بیوی بنا دیا تھا ورنہ وہ لڑکی خدیجہ اس کے ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی شوخ اور زہریلی لڑکی تھی۔ یہاں کے تین چار لُٹھے جوان خدیجہ کی ہنسی مذاق کی وجہ سے غلط فہمی میں آگئے اور انہوں نے خدیجہ کے ہاتھوں جوتے کھائے .... آپ سجاد کی حیثیت دیکھیں۔ اس کی منیاری کی معمولی سی دکان تھی۔ آدمی بے غیرت ہے۔ معلوم نہیں اس نے کیا چکر چلائے۔ کس طرح اپنی عزت اور غیرت بیچی اور ٹھیکیدار بن گیا۔ اس کے گھر میں جب دولت آئی تو اس کی آنکھوں میں جو تھوڑی بہت شرم رہ گئی تھی، وہ بھی نکل گئی۔ اس نے انسان کو انسان سمجھنا چھوڑ دیا۔ مقتول نے اسے کہا تھا کہ باپ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اس لیے جائداد تقسیم کرا لینی چاہیئے۔ اس نے تقسیم میں کوئی جھگڑا کھڑا کر دیا۔ اگر آپ اس کے باپ سے یا مقتول کے سسر سے بات کریں تو آپ کو کچھ نئی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ میں آپ کو پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مقتول کا اپنا کوئی دشمن نہیں تھا۔"

نمبردار کو میں نے کچھ دیر اور بٹھائے رکھا اور اس سے کئی اور باتیں پوچھیں۔ اس شخص نے میرا ذہن بدل ڈالا۔ میں خود محسوس کرنے لگا کہ سجاد اپنے بھائی کا قاتل ہو سکتا ہے۔ میں نے اس کے باپ کو بلایا اور نمبردار کو بھیج دیا۔

ضعیف العمر باپ بہت ہی غمگین تھا۔ وہ روتا ہوا میرے پاس آیا۔ میں نے اسے عزت سے اپنے پاس بٹھایا۔ میرے پوچھے بغیر اس شخص نے پہلی بات یہ کہی — "مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا بڑا بیٹا اتنا ظالم ہو جائے

گا کہ اپنے چھوٹے بھائی کو قتل کر دے گا۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ قاتل سجاد ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ میرے بیٹے کو کس نے قتل کیا ہے؟" —— بوڑھے باپ نے رندھیائی ہوئی آواز میں جواب دیا —

"میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ بھائیوں کے درمیان دشمنی کی وجہ پیدا ہو گئی تھی جو سجاد نے پیدا کی تھی۔ میرے دو مکان ہیں۔ ایک یہ حویلی ہے۔ ایک چھوٹا مکان ہے جس میں میں اور میری بیوی رہتے ہیں۔ تیسرا مکان بھی ہے جس میں میرا یہ چھوٹا بیٹا رہتا تھا جو قتل ہو گیا ہے۔ یہ بیٹا اتنا برخوردار تھا کہ اس نے مکان خریدا اور میرے نام رجسٹری کرا دی۔ کہتا تھا کہ جب تک آپ زندہ ہیں ساری جائیداد آپ کی ہے۔ دو دکانیں ہیں، دونوں اپنی ہیں۔ شہر کے ساتھ ہی بارہ چودہ بیگھہ زمین ہے۔ میرا مقتول بیٹا صادق اپنے بھائی سے قطع تعلق کرنے کے لیے کہتا تھا کہ اپنی زندگی میں جائیداد تقسیم کر دو۔ سجاد نے اتنے زیادہ حصے کا مطالبہ کیا جو میں اُسے دینے پر رضامند نہیں تھا۔ اس بات پر دونوں بھائیوں میں جھگڑا پیدا ہو گیا......

"سجاد اس قدر بددیانت اور بدطینت آدمی ہے کہ صادق نے اس کے ٹھیکیداری کے کاروبار میں کچھ رقم لگائی تھی۔ سجاد نے کبھی اپنے چھوٹے بھائی کو منافع کا ایک پیسہ نہیں دیا تھا۔ اب صادق نے اس جھگڑے کے بعد سجاد سے کہا کہ اُس نے جو رقم لگائی تھی وہ اسے واپس کر دے۔ سجاد نے پہلے تو ٹال مٹول کی پھر صاف مکر گیا کہ اُس نے رقم لی ہی نہیں تھی۔ صادق کی اپنی دکان بڑی اچھی چلتی تھی۔ اُس نے سجاد کے ساتھ اس طرح قطع تعلق کیا کہ سات آٹھ مہینوں سے بھائیوں کی آپس میں بول چال بھی بند تھی۔ میں نے سجاد کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اُس نے بڑی بے عزتی کر دی۔ میری اور میری بیوی کی دیکھ بھال صادق کرتا تھا۔ ہمارے تمام اخراجات اُس نے اپنے سر لے رکھے تھے۔ مجھے جب

پتہ چلا کہ صادق سجاد کے گھر میں قتل ہو گیا ہے تو مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ میں جب ہوش میں آیا تو میری بیوی اور محلّے کے دو آدمی میرے پاس بیٹھے ہوتے تھے۔ میں نے کہا کہ تھوڑی سی جائیداد کے پیچھے بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا ہے"۔

بولتے بولتے بوڑھے کی دھاڑیں نکل گئیں اور وہ بڑی زور زور سے کہنے لگا —— "مجھ سا بدقسمت کون ہو گا۔ اس آخری عمر میں بیٹے نے دھتکار کر نکال دیا۔ اب ایک بیٹا قتل ہو گیا ہے دوسرا پھانسی چڑھ جائے گا۔"

اس سے کچھ اور باتیں پوچھ کر میں نے اسے باہر بھیج دیا اور مقتول کے سسر کو بلایا۔

شہزادیوں جیسی عیش کراؤں گا

مقتول کا سسر بھی اسی حالت میں میرے پاس آیا، جس حالت میں اس کا باپ آیا تھا۔ یہ شخص خوش وضع تھا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ سجاد اور صادق میں جائیداد کا کوئی جھگڑا چل رہا تھا؟" —— میں نے اُس سے پوچھا۔

"جی ہاں" —— اُس نے جواب دیا —— "سجاد جائیداد پر لمبا ہی ہاتھ مارنا چاہتا تھا۔"

"کیا ان کے درمیان دشمنی اتنی زیادہ تھی کہ ایک بھائی دوسرے کو قتل کر دیتا؟"

اُس نے فوراً جواب نہ دیا۔ پہلے اُس نے سر جھکایا، پھر اُس نے میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو بات اُس کے دل میں ہے وہ کہے یا نہ کہے۔

"میرا سوال اتنا پیچیدہ تو نہیں کہ آپ چُپ ہی ہو گئے ہیں" —— میں نے کہا۔

"سوال تو پیچیدہ نہیں" ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ "جواب کچھ پیچیدہ ہے ..... بات ایسی ہے جو زبان پر لاتے بھی شرم آتی ہے۔"

"اس شرم کو الگ رکھ دیں" ـــــ میں نے کہا ـــ "آپ کا داماد قتل ہو گیا ہے۔ جب تک آپ میری رہنمائی نہیں کریں گے میں قاتل کو نہیں پکڑ سکوں گا۔ میں جادوگر نہیں۔ آپ کے دل میں جو بات آتی ہے وہ سوچے سمجھے بغیر مجھے بتا دیں۔ میں ایسا تو نہیں کروں گا کہ آپ راز کی کوئی بات مجھے بتائیں گے تو میں وہ ہر کسی کو سناتا پھروں گا۔ میں آپ کی عزت کا پورا خیال رکھوں گا۔"

"اگر مجھے اپنی سفید پوشی کا خیال نہ ہوتا تو سجاد کو میں پہلے قتل کر چکا ہوتا" ـــــ مقتول کے سسر نے کہا ـــــ "ان دونوں بھائیوں کے درمیان صرف جائیداد پر دشمنی نہیں تھی، دشمنی کی اصل وجہ کچھ اور تھی ..... سجاد کنجروں جیسا بے غیرت ہے۔ اس نے تین مرتبہ میری بیٹی یعنی مقتول کی بیوی پر دست درازی کی تھی۔ اسے تحفے پیش کرتا تھا اور دو تین مرتبہ اس کے لیے ریشمی کپڑے بھی لایا تھا جو میری بیٹی نے قبول نہیں کیے تھے۔ مجھے میری بیٹی نے بہت بعد میں بتایا تھا کہ سجاد اس پر بری نظر رکھتا ہے اور بڑی بیہودہ حرکتیں کر چکا ہے۔ یہ چند روز پہلے کی بات ہے۔ سجاد کی تیسری بیوی اسے چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ سجاد نے کوئی بہانہ بنا کر میری بیٹی کو اپنے گھر بلایا۔ میری بیٹی نے اپنے خاوند سے پوچھا۔ میرا داماد بڑا ہی شریف اور سیدھا سادا تھا۔ اس کے دل میں بھائی کی محبت جاگ اٹھی حالانکہ ایک عرصے سے ان کی آپس میں بول چال بھی بند تھی۔ میرے داماد نے [illegible] سے کہا کہ آخر میرا بڑا بھائی ہے، ہو سکتا ہے وہ کسی تکلیف میں ہو۔ اس طرح میری بیٹی سجاد کے گھر چلی گئی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گئی۔ اس نے اپنے خاوند کو بتایا کہ وہ سجاد کے گھر گئی تو سجاد

نے اس کے آگے کچھ رقم رکھی، ریشمی کپڑوں کا جوڑا بھی رکھا اور سونے کا ایک ہار بھی اس کے آگے رکھ دیا اور اپنی شیطانی نیت کا اظہار کیا۔ میری بیٹی نے بڑے غصے سے اسے دھتکارا۔ اس نے میری بیٹی کو پکڑ لیا لیکن وہ بھاگ آئی۔ میں اور صادق سجاد کے پاس گئے تو اس نے ہماری بے عزتی کی اور کہا کہ میری بیٹی جھوٹ بولتی ہے .... میں یہیں تک جانتا ہوں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ صادق کس طرح رات سجاد کے گھر رہنے کے لیے چلا گیا تھا۔"

یہ بہت بڑا انکشاف تھا جو اس شخص نے کیا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ جھوٹی الزام تراشی نہیں کر رہا، میں نے اپنے انداز سے بہت جرح کی۔ آخر اسے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو میرے پاس بھیج دے۔

اس کی بیٹی کے آنے تک میں محلے کے دو معزز آدمیوں کو بلا کر ان سے پوچھتا رہا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ مقتول بہت ہی سیدھا اور شریف انسان تھا۔ سجاد کے متعلق انہوں نے جو بھی بات کی وہ سجاد کے خلاف جاتی تھی۔ ان دونوں نے پختہ شک کا اظہار کیا کہ مقتول کو سجاد نے قتل کیا ہے یا کروایا ہے۔ انہوں نے بھی سجاد کو بددیانت اور بدطینت کہا۔

ایک جوان اور بڑی پرکشش شکل و صورت والی عورت جس نے چادر اوڑھ رکھی تھی، اندر آئی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے پیچھے پیچھے مقتول کا سسر تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ ہے میری بیٹی، مقتول کی بیوہ۔ میں نے سب کو باہر نکال دیا اور مقتول کی بیوہ کو بٹھا لیا۔ میں نے حسب عادت اس کے ساتھ افسوس اور ہمدردی کی باتیں کیں اور دلجوئی بھی کی۔ پھر اس سے پوچھا کہ وہ کیا سمجھتی ہے کہ اس کے خاوند کو کس نے قتل کیا ہوگا۔

"اس کے بڑے بھائی کے سوا قاتل اور کون ہو سکتا ہے" ـــــ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔

"دشمنی کیا تھی؟"

اس نے دشمنی کی وہی وجوہات بتائیں جو مقتول کا باپ نمبردار اور مقتول کا سسر مجھے پہلے بتا چکے تھے۔ اُس نے یہ نہ کہا کہ سجاد نے اُس پر کبھی دست درازی کی تھی۔

"لیکن میرا خیال کچھ اور ہے" ——— میں نے کہا ——— "جائیداد کی تقسیم پر بھائیوں میں جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اگر سجاد اپنے چھوٹے بھائی کو قتل کرنا ہی چاہتا تو کچھ عرصہ پہلے بھی کر سکتا تھا۔ میں تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جائیداد کے علاوہ ان کے درمیان کوئی اور دشمنی بھی تھی؟"

"جی" ——— اس نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا، اور دبی دبی آواز میں بولی ——— "سجاد کبھی کا میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اپنے بھائی کی غیر حاضری میں میرے گھر آیا اور مجھے لالچ دینے لگا اور میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ بھی کی۔ میں نے اپنے خاوند کو بتایا۔ میرا خاوند شریف آدمی تو تھا لیکن بزدل اور بے غیرت نہیں تھا۔ وہ اسی وقت اپنے بھائی کے پاس گیا اور اُس کی بے عزتی کر کے آیا۔ تھوڑے دن ہوئے سجاد نے یہ پیغام بھیجا کہ شہر سے میرے کاروبار کے سلسلے کے مہمان آرہے ہیں۔ ان کے لیے کھانا پکانے والا کوئی نہیں۔ اس نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ میں بخار سے مر رہا ہوں۔ میرے خاوند کا دل پسیج گیا۔ اُس نے مجھے بھیج دیا۔"

اس عورت نے وہی بات سنائی جو اس کا باپ مجھے پہلے ہی سنا چکا تھا۔ اس نے نئی بات یہ بتائی کہ تین چار دن ہوئے سجاد نے محلے کی ایک عورت کی زبانی یہ پیغام بھیجا کہ تم اس بدھو سے آدمی کے ساتھ اچھی نہیں لگتیں۔ میں تمہارے ساتھ ناجائز تعلق قائم نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہارے ساتھ باقاعدہ شادی کروں گا۔ تم میرے بھائی سے طلاق لے لو۔ میں تمہیں شہزادیوں جیسی عیش کراؤں گا . . . میں نے اپنے خاوند کو بتا دیا۔ خاوند نے کہا کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اس شخص کے ساتھ میں کیا سلوک کروں۔ مجھے معلوم نہیں کہ دونوں بھائیوں کے درمیان کوئی بات ہوتی تھی یا نہیں . . . .

کل صبح کی بات ہے۔ سجاد ہمارے گھر آیا۔ میرا خاوند ابھی دکان پر نہیں گیا تھا۔ سجاد بڑا ہی بے غیرت اور چالاک آدمی ہے۔ اُس نے میرے خاوند کو گلے لگایا پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا کہ مجھ سے غلطی ہوتی تھی، مجھے معاف کر دینا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں جائیداد کا تنازعہ بھی ختم کر دوں گا۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا کہ وہ شہر جا رہا ہے رات وہیں رہنا پڑے گا۔ گھر میں رقم بڑی زیادہ رکھی ہوئی ہے اس لیے میں گھر نوکر کے حوالے نہیں کر سکتا۔ اُس نے میرے خاوند سے کہا کہ وہ رات اُس کے گھر سوئے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا خاوند اُس کی بات مانے لیکن میرا خاوند اپنی شرافت سے ایسا مجبور ہوا کہ اُس نے سجاد سے کہا کہ وہ رات اُس کے گھر سوئے گا۔ شام کا کھانا کھا کر میرا خاوند سجاد کے گھر چلا گیا۔ سجاد اُسے چابی دے گیا تھا۔ صبح اطلاع ملی کہ میرا خاوند قتل ہو گیا ہے۔"

میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس نے سجاد کو دھمکی دی تھی کہ وہ اُسے بدنام کرے گی۔ اس دھمکی کے جواب میں وہ ہنس پڑا تھا، جیسے اُسے کسی کا ڈر یا خطرہ نہ ہو۔

اس عورت کے بعد میں نے اُس عورت کو بلایا جس کے متعلق اس عورت یعنی مقتول کی بیوی نے بتایا تھا کہ وہ اس کے پاس سجاد کا پیغام لے کر آئی تھی۔ اس عورت نے کوئی پس و پیش نہ کی۔ کہنے لگی کہ وہ سجاد کا یہ پیغام مقتول کی بیوی تک لے گئی تھی اور بیوہ نے اُسے بہت گالیاں دی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ سجاد شہر کی دو تین اور عورتوں کو بھی پیغام بھیجتا رہتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس عورت نے بھی ثابت کیا سجاد بدکار آدمی تھا۔

نوعمر ہندو لڑکا اور شہر کی طوائفیں

حالات، واقعات اور باتیں سجّاد کو مجرم ثابت کر رہی تھیں۔ میں نے خود جب ان قرائن پر غور کیا تو سجّاد کے خلاف میرا شک پختہ ہو گیا۔ میرا دھیان سجّاد کی پہلی بیوی کی طرف چلا گیا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا تھا کہ طلاق کے اتنے عرصے بعد اُس نے یا اُس کے خاندان کے کسی آدمی نے سجاد پر یہ وار کیا ہو کہ اس کے بھائی کو قتل کر دیا ہو۔ مقتول کے متعلق مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اُس کی اپنے بھائی کے سوا کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ ابھی تو مجھے اپنے خفیہ مخبروں سے بہت کچھ معلوم کرنا تھا لیکن جن لوگوں سے میں پوچھ گچھ کر چکا تھا وہ میرے تجربے کے مطابق قابلِ اعتماد نظر آتے تھے۔ سجّاد کی پہلی بیوی سے مجھے کچھ باتوں کی تصدیق کرنی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ پہلی بیوی سجّاد کے خلاف جلی بھنی ہو گی لہٰذا وہ پوری کوشش کرے گی کہ سجّاد کو پھنسائے۔ اس کے باوجود میں نے اُسے بلا لیا۔

وہ اسی قصبے میں ساتھ والے محلّے میں رہتی تھی۔ میرے بلاوے پر وہ اپنے خاوند کے ساتھ آئی۔ طلاق کے بعد اُس نے شادی کر لی تھی۔ میں نے اُس کے خاوند کو تسلّی دلاسہ دیا اور اُسے بتایا کہ میں نے اُسے کیوں بلایا ہے، خاوند اُسے میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔

یہ بالکل گھریلو سی عورت تھی۔ سجاد جیسے نو دولتیے اور اوچھے آدمی کے گھر یہ فٹ بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود نہیں بولتی تھی، مجھے سوال کر کر کے اُس سے باتیں پوچھنی پڑیں۔ اُس نے بتایا کہ جب گھر میں دکان کی آمدنی آتی تھی تو زندگی بڑے مزے میں گذر رہی تھی۔ دولت نے آ کر گھر میں ایسی بے برکتی پیدا کی کہ سب سے پہلے بجلی اس عورت پر گری اور اسے طلاق مل گئی۔ اس عورت نے بتایا کہ سجاد کی دوستی ایک بڑے خوبصورت اور نوعمر ہندو لڑکے کے ساتھ تھی۔ جب اس کی

ٹھیکیداری چل نکلی تو اس گھر میں چھاؤنی والے شہر کی طوائفیں بھی آئیں۔ اس عورت نے جب احتجاج کیا تو سجاد اس کے ساتھ بگڑنے لگا۔ ان کا آپس میں لڑائی جھگڑا بھی ہوا۔ سجّاد نے اسے ایک بار یہاں تک کہہ دیا وہ اسے طلاق دے دے گا، اُس لڑکے کی دوستی ترک نہیں کرے گا۔

اس بیوی نے کچھ عرصہ اور برداشت کیا۔ اُس کے بھائی اسے اُکساتے تھے کہ ایسے بدکار آدمی سے طلاق لے لو لیکن یہ عورت طلاق سے ڈرتی تھی۔ آخر ایک روز اس عورت نے سجّاد سے کہہ دیا کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ سجّاد نے کہا کہ اُس کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ اُس نے یہ الفاظ کہے تھے ——— "مجھے کسی کی بیوی پسند آ گئی تو میں اُس کے خاوند کو غائب کرا کے اُس کی بیوی سے شادی کر لوں گا۔ تم مجھے نہیں جانتیں کہ میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔"

"سجّاد کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" ——— میں نے پوچھا ——— "کیا یہ اتنا دلیر ہے کہ کسی کو قتل کر دے؟"

"سچّی بات بتاؤں آپ کو؟" ——— اُس نے کہا ——— "سخت بزدل آدمی ہے" ——— اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی اور اُس نے سر جھکا لیا۔ میری حوصلہ افزائی سے وہ بولی ——— "اس شخص میں نہ مردوں والی دلیری ہے نہ اس میں مردوں والی کوئی بات ہے۔ میں نے اس کے ساتھ جو وقت گذارا ہے وہ میں ہی جانتی ہوں کہ کیسے گذارا ہے۔ اس کے پاس صرف ایک طاقت ہے اور وہ ہے پیسہ۔ اگر میرے ماں باپ کے پاس اتنا پیسہ ہوتا تو ہم اسے کچہریوں میں ذلیل و خوار کرتے۔ میں اتنے سال اس کی بیوی رہی، بچّہ ایک بھی نہ ہُوا۔ طلاق کے ایک سال بعد میری دوسری شادی ہوئی۔ اب میرے تین بچّے ہیں۔"

اس عورت سے میں نے اور بھی باتیں پوچھیں لیکن واردات

کے متعلق مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ سجاد کے چال چلن کے متعلق بہت
سے اشارے مل گئے۔ ضروری نہیں تھا کہ اس عورت نے سجاد کے متعلق
جو باتیں کی تھیں وہ ساری ہی سچی تھیں۔ وہ آخر اس شخص کے ہاتھوں ستائی
ہوئی عورت تھی۔ اُسے جب میں نے جانے کی اجازت دے دی اور
وہ بیٹھک سے نکل گئی تو سجاد اندر آ گیا۔

"ملک صاحب!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "آپ ایسے لوگوں
کو تفتیش میں شامل کر رہے ہیں جو سب کے سب میرے خلاف ہیں
خدا نے مجھے عزت اور پیسہ دے دیا ہے۔ یہ سب لوگ مجھ سے
جلتے ہیں۔ یہ آپ کو غلط باتیں بتائیں گے اور ان کی ہر بات میرے خلاف
ہوگی۔"

"آپ اس مخالفت سے کیوں ڈرتے ہیں؟" ـــــ میں نے
کہا ـــــ "اپنے بھائی کو آپ نے خود تو قتل نہیں کیا۔ آپ باہر آرام
سے بیٹھیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے انہی مخالفوں میں سے مجھے آپ کے
بھائی کا قاتل مل جائے۔"

اُسے باہر بھیج کر میں نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اُسے کہا کہ
سجاد کو اپنے پاس بٹھائے رکھے۔ اُسے پتہ نہ چلنے دے کہ اُسے نگرانی
میں رکھا جا رہا ہے لیکن اُسے یہاں سے اُٹھنے بھی نہ دے۔

ہیڈ کانسٹیبل پوسٹمارٹم رپورٹ لے کر آ گیا۔ لاش پر تیز دھار آلہ
چھری یا چاقو کے وہی تین زخم تھے جو میں نے دیکھے تھے۔ ان میں سے
ایک زخم دل تک پہنچ گیا تھا جس سے مقتول کی موت واقع ہوئی۔
ڈاکٹر نے معدے میں گئی ہوئی خوراک سے اور اپنے دیگر طریقوں سے
موت کا وقت بارہ بجے کے لگ بھگ لکھا تھا۔ میں نے اپنے عملے
کو اور سجاد کو ساتھ لیا اور تھانے چلا گیا۔ وہ تھانے جانے پر رضامند
نہیں تھا۔ کہتا تھا کہ بھائی کی لاش لینی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ لاش

لینے والے یہاں موجود ہیں۔ میں نے اس کے سامنے اس کے باپ اور
مقتول کے سسر کو بلا کر کہا کہ وہ مردہ خانے جا کر لاش وصول کر لیں۔ سجاد
کو میں نے ساتھ لے لیا۔

تھانے لے جا کر اُسے برآمدے میں بٹھا دیا اور اُس پر ایک
کانسٹیبل کھڑا کر دیا۔ اپنے دستور کے مطابق میں آدھی رات کے بعد
اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔

بچوں کی طرح رو پڑا

رات کا ایک بج رہا تھا جب میں گھر سے تھانے آیا اور سجاد
کو اپنے کمرے میں بٹھایا۔ وہ شرابی کبابی آدمی تھا۔ تھانے میں میری
ہدایت کے مطابق پانی کے سوا اُسے کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اُس کی
حالت یہ ہو چکی تھی کہ اُس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

"سجاد بھائی!" ـــــ میں نے اُس سے کہا ـــــ "میں تم
سے کوئی بات بھی پوچھوں گا تو تم کہو گے کہ یہ بات مجھے تمہارے کسی مخالف
نے بتائی ہے۔ تم میری یہ تسلی کر دو کہ اپنے بھائی کو تم نے خود قتل نہیں
کیا۔"

وہ اس طرح اُچھل پڑا جیسے میں نے اُس کی پیٹھ پر خنجر مار دیا ہو۔
اُس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ تمہاری یہی حالت ہو گی" ـــــ میں نے کہا ـــــ
"اگر صحیح بات بتا دو تو میں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔"

اُس کی زبان چل پڑی۔ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر رہا
تھا۔ اُس نے قسمیں بھی کھائیں اور بہت کچھ کہا۔ مجھے ایسی توقع بالکل نہیں
تھی کہ وہ فوراً جرم کا اقبال کر لے گا۔ میں نے اُسے اقبالِ جرم پر بہت
اُکسایا لیکن وہ انکار کرتا رہا۔

"میرے ایک سوال کا جواب دے کر میری تسلی کر دو اور چھٹی

کرو" ــــــ میں نے کہا ــــــ "کئی مہینوں سے چھوٹے بھائی کے ساتھ تمہاری بول چال بند تھی۔ صرف کل تمہیں کیا ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے بھائی کو تم نے کہا کہ وہ رات کو تمہارے گھر سوئے؟"

"ملک صاحب!" ــــــ اُس نے جھنجلا کر کہا ــــــ "میں ابھی ابھی معلوم نہیں کتنی مرتبہ آپ کو بتا چکا ہوں کہ رات کو میں یہاں تھا ہی نہیں۔ میں کل بارہ بجے کے بعد چھاؤنی چلا گیا تھا اور میں آج صبح واپس آیا ہوں۔ میرا بھائی رات کو قتل ہوا ہے۔ اُسے گھر میں سلانے کی وجہ بھی آپ کو بتا چکا ہوں۔ گھر میں رقم زیادہ تھی۔ میں نوکر پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔"

"کیا اس سے پہلے کبھی گھر میں اتنی رقم نہیں آئی تھی؟"

"رقم تو اس سے زیادہ بھی آتی رہی ہے" ــــــ اُس نے جواب دیا ــــــ "اور میں بعض راتیں باہر بھی رہا ہوں لیکن میری بیوی گھر میں ہوتی تھی اور وہ اپنے بھائی کو بھی بلا لیا کرتی تھی۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے مقتول کی بیوی پر کئی بار دست درازی کی؟" ــــــ میں نے پوچھا۔ اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے کہا ــــــ "یہ سوچ کر جھوٹ بولنا کہ میں تمہارے متعلق اُن لوگوں سے سب کچھ پوچھ چکا ہوں جن کے ساتھ تمہارا بڑا گہرا تعلق ہے۔ تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ میں نے تمہارے گھر میں اُس عورت کو بھی بلایا تھا جو تمہارے پیغام مقتول کی بیوی تک لے جاتی اور لاتی تھی۔ کیا تمہیں اچھا لگے گا کہ میں اُس ہندو لڑکے کو یہاں بلاؤں جس کے ساتھ تمہارا گہرا دوستانہ رہا ہے۔ میں ایسے دو تین لڑکے اور بھی بلا سکتا ہوں۔"

"ملک صاحب!" ــــــ اُس نے روتی ہوئی آواز میں کہا ــــــ "خدا کے لیے مجھ پر یہ ظلم نہ کریں۔ میں نے اپنے بھائی کو قتل نہیں کیا اور قتل کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ مقتول کی بیوی خود میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی لیکن میں اُسے اپنے چھوٹے بھائی کی بیوی سمجھتے ہوئے

اپنی بہن سمجھتا تھا ..... میں اپنی شرافت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کروں گا۔ اگر میں کسی عورت کے ذریعے کسی کو پیغام بھیجتا رہا ہوں یا میری دوستی غلط لوگوں کے ساتھ ہے تو یہ کوئی ثبوت نہیں کہ میں نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے۔"

میں نے اُس کے سامنے وہ تمام باتیں رکھیں جو مجھے مختلف لوگوں سے معلوم ہوئی تھیں لیکن کسی بات کو اُس نے ذرا سا تسلیم کیا اور کسی بات سے اُس نے بالکل ہی انکار کر دیا۔ میں نے یہ دیکھا کہ اپنی پہلی بیوی کے کہنے کے مطابق وہ بزدل آدمی تھا۔ ایک بار تو وہ بچوں کی طرح رو پڑا۔ میں بار بار یہی کہتا رہا کہ اپنے بھائی کے قاتل تم ہو۔

"اگر تم بے گناہ ہو تو مجھے یہ بتا دو کہ تمہارے بھائی کا دشمن کون تھا جس نے اُسے قتل کر دیا" ــــــ میں نے پوچھا۔

"میرا کاروبار اُس سے الگ تھا" ــــــ سجاد نے جواب دیا ــــــ "میں نہیں بتا سکتا کہ اُس نے کس کے ساتھ اتنی گہری دشمنی رکھی ہوئی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے مجھے نئی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اب سمجھ نہیں آتی کہ میں اُس کے دشمنوں کو تلاش کروں یا اپنی جان بچاؤں .... اور آپ میری یہ بات غالباً تسلیم بھی نہیں کر رہے کہ میں واردات کی رات یہاں تھا ہی نہیں۔"

صبح کے چار بج رہے تھے۔ یہ شخص اب بات بات پر بچوں کی طرح رو پڑتا تھا۔ تھانیدار اگر آنسوؤں سے متاثر ہو جائیں تو وہ کسی بھی مجرم کو نہ پکڑ سکیں

میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ یہ آدمی مضبوط دل گردے والا نہیں لیکن ڈھیٹ ہڈی کا آدمی ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھے یہ تصدیق کر لینی چاہیے کہ اُس نے واقعی رات شہر میں گزاری تھی۔ ایک ریل گاڑی پونے چھ بجے گزرتی تھی جو شہر کی طرف جاتی تھی۔ میں نے سجاد کے کھانے پینے کا انتظام کیا اور ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ میرے ساتھ شہر چلے۔

طوائفوں کے بازار میں

میں اُسے پونے چھ بجے والی گاڑی سے شہر لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اُسے کہا کہ جہاں جہاں وہ گیا تھا وہاں مجھے لے چلے۔ وہ مجھے ایک فوجی دفتر میں لے گیا جہاں سے اُسے ٹھیکے ملتے اور وہ مال سپلائی کرتا تھا۔ دفتر ابھی ابھی کھُلے تھے۔ وہاں سے یہ پتہ چلا کہ سجّاد وہاں گیا تھا۔ میں نے یقین نہ کیا۔ دو کلرک تھے اور ایک سپرنٹنڈنٹ۔ میں نے ان لوگوں پر اس لیے یقین نہ کیا کہ سجّاد کا بلکہ ہر ایک ٹھیکیدار اور سپلائر کا کاروبار رشوت پر چل رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ انہیں سجّاد سے رشوت ملتی ہے۔ اب انہوں نے دیکھا ہے کہ سجّاد ایک تھانیدار اور ایک کانسٹیبل کے ساتھ آیا ہے تو انہیں شک ہُوا کہ سجّاد کسی چکر میں پھنس رہا ہے لہذا اُسے بچانے کے لیے انہوں نے کہہ دیا کہ یہ اس دفتر میں آیا تھا۔

باہر آکر میں نے سجّاد سے پُوچھا کہ وہ رات کہاں ٹھہرا تھا۔ وہ خاموش رہا۔

"تم کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہو گے" ——— میں نے کہا ——— "مجھے اُس ہوٹل میں لے چلو۔"

وہ پھر بھی چُپ رہا۔ پھر احمقوں کی طرح ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی مجھے اتنی بُری لگی کہ اگر وہ تھانے میں ہوتا تو معلوم نہیں میں اُس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ ہم باہر سڑک پر کھڑے تھے۔ میں نے اُسے غصّے سے کہا کہ وہ مجھے اُس ہوٹل میں لے چلے۔

"دراصل میں کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہرا تھا" ——— اس نے دبی دبی سی آواز میں کہا۔

"پھر کہاں ٹھہرے تھے؟"

"جانے دو ملک صاحب!" ——— اُس نے عجیب سی بے تکلّفی سے کہا ——— "آپ مان لیں کہ میں نے بھائی کو قتل نہیں کیا۔ میں

آپ کی نقد خدمت کروں گا۔ آپ جو حکم کریں گے پیش کروں گا۔"

"تم اپنے آپ کو پیش کر دو" ——— میں نے کہا ——— "میں نے تمہاری عزّت افزائی کی ہے کہ ہتھکڑی ساتھ نہیں لایا۔ میں یہاں کے کسی بھی تھانے سے ہتھکڑی لے سکتا ہوں۔ ہتھکڑی لگا کر سارے شہر میں گھماؤں گا۔ صاف کہہ دو کہ تم نے رات یہاں نہیں بلکہ اپنے گھر میں گزاری تھی۔"

"میں نے رات ایک طوائف کے پاس گزاری تھی" ——— اُس نے کہا۔

"مجھے وہاں لے چلو" ——— میں نے کہا۔

وہ ایک تانگے پر مجھے طوائفوں کے بازار میں لے گیا۔ بازار سے گزار کر وہ ایک بڑے اچھے مکان میں داخل ہوا اور دوسری منزل میں جا پہنچا۔ میں اس گھر کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ ایک اونچے درجے کی طوائف کا گھر ہے۔ ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہاں دو آدمی فرشی دری پر لیٹے ہوئے تھے، پولیس کو دیکھ کر وہ اُچھل پڑے۔ میں نے انہیں کہا کہ اپنی بائی کو بلاؤ۔ پتہ چلا کہ وہ دوسرے کمرے میں سوئی ہوئی ہے۔ میرے کہنے پر اُسے جگا لائے۔ وہ بڑی خوبصورت اور جوان طوائف تھی۔ ایک تھانیدار اور ایک کانسٹیبل کو دیکھ کر جو خوف اُس پر طاری تھا وہ اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ میری خاطر تواضع کے لیے اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ فلاں فلاں چیز لے آؤ۔

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" ——— میں نے طوائف سے کہا ——— "بس جو کچھ معلوم کرنے آیا ہوں وہ مجھے بتاؤ۔ پھر میں فوراً چلا جاؤں گا۔"

اُس نے مجھے بیٹھنے کو کہا لیکن میں کھڑا رہا۔ میں نے سجّاد کی طرف اشارہ کر کے اُس سے پوچھا ——— "اسے جانتی ہو؟"

طوائف نے سجّاد کو بڑے غور سے دیکھا، پھر سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں سجّاد کے پاؤں سے اُس کے سر پر چلی گئیں۔

"صورت جانی پہچانی لگتی ہے" ——— طوائف نے کہا ——— "شاید کبھی یہاں آیا ہو"۔

سجاد کچھ بولنے لگا تھا۔ میں نے اُسے روک دیا اور طوائف سے پوچھا ——— "کیا یہ شخص کل رات تمہارے ہاں ٹھہرا تھا؟"

"ٹھہرا تھا؟" ——— طوائف نے حیران ہو کر کہا ——— "کل رات تو یہ یہاں آیا ہی نہیں تھا، آپ کہتے ہیں ٹھہرا تھا"۔

"تم جھوٹ بولتی ہو" ——— سجاد نے غصّے سے گرجتے ہوئے کہا ——— "میں شام کے بعد یہاں آیا تھا اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں یہاں سے کس وقت گیا تھا"۔

طوائف کا ایک آدمی ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور التجا کے لہجے میں بولا ——— "حضورِ والا! یہ ہمارے کسی دشمن کا بھیجا ہُوا آدمی ہے یا اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے ہم کل رات کی بات کس طرح بھول سکتے ہیں۔ یہاں لوگوں کا ہجوم تو نہیں آتا۔ یہاں گنتی کے وہ آدمی آتے ہیں جن کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اس شخص کی شکل دیکھو، اس جیسے آدمی ہماری بائی کی دہلیز پر قدم رکھنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے۔ کل رات جو لوگ یہاں آئے تھے ان میں سے ہر ایک کا نام بتا سکتا ہوں"۔

سجاد انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ چیختا اور چلّاتا تھا لیکن طوائف اور اُس کے آدمی یہی کہے جا رہے تھے کہ یہ آدمی اُن کے ہاں نہیں آیا۔ میں سجاد کو وہاں سے باہر لے آیا۔ اُس نے اودھم بپا کر رکھا تھا۔ میں نے اُسے چُپ کرانے کے لیے کہا کہ میں اُسے ہتھکڑی لگا لوں گا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں سجاد اور کانسٹیبل کو ساتھ لے کر ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ سجاد میرے پیچھے پڑ گیا کہ کھانے کا آرڈر وہ دے گا۔ میں نے اُسے منع کر کے سیدھا سادا کھانا منگوا لیا۔ کھانے کے دوران اُس نے ایک انکشاف کیا۔

"ملک صاحب!" ——— اُس نے کہا ——— "بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ میں رات اس طوائف کے ہاں آیا تھا۔ چار پانچ اور آدمی بھی تھے۔ مجھے معلوم نہیں وہ کون کون تھے۔ ہم سب اس طوائف کے ناچ کے تماشائی تھے۔ ناچ کے دوران شراب چلتی رہی۔ میں نے طوائف کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں رات یہیں گزاروں گا۔ میں زیادہ پی گیا تھا میں جب ہوش میں آیا تو میں رانی باغ میں لڑکھڑاتا ہُوا چل رہا تھا۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں طوائف کے گھر سے کس طرح نکلا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے بہت پی لی تھی، شاید میں نے اودھم بپا کیا ہو اور طوائف کے آدمیوں نے مجھے اُٹھا کر باہر پھینک دیا ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کہیں گر پڑا تھا یا نشے کی حالت میں ہی شہر میں گھومتا پھرتا رہا اور ہوش اُس وقت آئی جب میں شہر کے اُس باغ میں لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی، صبح کے چار بج چکے تھے۔ مجھ میں اب اتنا دم نہیں تھا کہ میں طوائف کے گھر جاتا۔ صبح ساڑھے چار بجے کے بعد پہلی لاری نکلتی ہے۔ میں لاریوں کے اڈے پر چلا گیا۔ پہلی لاری تیار تھی۔ میں اُس میں بیٹھ گیا اور اپنے گھر پہنچا۔ اگر آپ مجھے کچھ مہلت دے دیں تو میں اس طوائف کو کچھ دے دلا کر کہلوا لوں گا کہ میں نے رات اُس کے ہاں گزاری تھی"۔

"تمہیں مہلت دینا ایسا ہی ہے جیسے میں نے تھانیداری اُتار کر طوائف کے کوٹھے پر پھینک دی ہو" ——— میں نے کہا ——— "لاری کی سواریوں میں سے کوئی آدمی مجھ سے ملوا دو جو یہ کہے کہ تم اس لاری سے گئے تھے"۔

"مجھے اس لاری میں بڑی مشکل سے جگہ ملی تھی" ——— سجاد نے کہا ——— "اپنے شہر میں اُترنے والا میں اکیلا تھا۔ باقی سب سواریاں آگے کی تھیں"۔

طوائف اور اُس کے آدمیوں کا یہ کہنا کہ یہ شخص اُن کے ہاں نہیں آیا، مشکوک سا بیان تھا۔ میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ لوگ پولیس

سے بہت ڈرتے ہیں۔ انگریزوں کے دَور میں تو یہ عصمت فروش پولیس کے سائے سے بھی بدکتے تھے۔ اکثر کیسوں میں جرائم پیشہ لوگ یہی کہا کرتے تھے کہ واردات کے وقت وہ فلاں طوائف کے کوٹھے پر تھے۔ ہم مان لیتے تھے کہ وہ شخص واقعی طوائف کے کوٹھے پر گیا ہوگا لیکن کوئی طوائف اور اُس کا کوئی بھی آدمی یہ نہیں کہتا تھا کہ ہاں یہ شخص اُن کے ہاں آیا تھا۔ یہ لوگ اپنے مستقل گاہکوں کو بھی اسی طرح دھوکہ دیا کرتے تھے۔

لائن پر لڑکی

میں سجّاد کو ریل گاڑی سے اپنے تھانے لے آیا۔ میں نے اس طرف توجّہ نہ دی کہ طوائف نے سجّاد کے متعلق جھُوٹ بولا ہوگا لیکن اِس شخص کے خلاف دوسری شہادت خاصی زیادہ تھی۔ مجھے اُس کے ثبوت کی ضرورت تھی۔ میں نے اُسے اپنے ایک خاص اختیار کے تحت حوالات میں بند کر دیا۔ اب مجھے مخبروں سے رپورٹیں لینی تھیں۔

شام کے وقت ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ سجّاد میرے ساتھ بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے حوالات سے نکلوا کر اور ہتھکڑی لگوا کر اپنے کمرے میں بُلا لیا۔ اُس سے پوچھا کہ وہ کیا بات کرنا چاہتا ہے؟

"آپ نے مجھ سے پُوچھا تھا کہ میری یا میرے بھائی کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں" —— اُس نے کہا —— "مجھے ایسا کوئی دشمن نظر نہیں آیا تھا۔ میں ایک آدمی کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ واردات اُس شخص نے کرائی ہو"۔

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ شخص اب کیوں یاد آیا ہے" —— میں نے پوچھا —— "انسان اپنے دوستوں اور دشمنوں کو نہیں بھُول سکتا"۔

"ملک صاحب!" —— اُس نے کھسیانہ سا ہو کر کہا —— "بات یہ ہے کہ میں نے جس طرح طوائف کا نام سوچ سوچ کر لیا تھا اسی طرح اس شخص کا نام لیتے ہوئے بھی میں جھجک سی محسوس کرتا رہا" —— اُس نے

قصبے سے چار ساڑھے چار میل دُور کے ایک گاؤں کا نام لے کر کہا —— "وہاں ابرار حسین نام کا ایک آدمی ہے جو وہاں کا مالدار زمیندار ہے۔ جوان آدمی ہے۔ میری بیوی خدیجہ اُس کے پاس ہے۔ میں نے آپ کو پہلے بتایا تھا کہ میں خدیجہ کو واپس گھر لانا ہی نہیں چاہتا۔ مجھے اس طرح پتہ چلا کہ ایک روز ایک دیہاتی آدمی میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے کہا کہ ابرار حسین اور خدیجہ نے کہا ہے کہ طلاق نامہ بھیج دو۔ میں نے یہ معلوم کر لیا کہ خدیجہ ابرار حسین کے پاس ہے۔ میں نے طلاق نامہ دینے سے انکار کر دیا۔ تین چار روز بعد یہ آدمی پھر آیا۔ اُس نے کہا کہ طلاق نامہ نہیں دو گے تو ہم ایسی کارروائی کریں گے کہ ہمیں طلاق نامے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابرار حسین اور خدیجہ مجھے قتل کرا دیں گے۔ میں نے اس دھمکی کی پرواہ نہ کی"۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں پتہ چل گیا تھا کہ تمہاری بیوی فلاں آدمی کے پاس ہے تو تم نے تھانے میں اطلاع کیوں نہ دی" —— میں نے پُوچھا —— "اور دوسری بات یہ کہ تمہیں اپنی بیوی اور اُس کے آشنا کی طرف سے دھمکی ملی تو بھی تم نے تھانے میں رپورٹ نہ دی۔ کیوں؟"

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں ایسی بیوی کو اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتا" —— اُس نے جواب دیا —— "اگر میں تھانے میں رپورٹ کراتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ خدیجہ کو میں اپنے گھر لے آتا۔ میں اُسے اپنے گھر میں نہیں لانا چاہتا تھا.... لیکن ملک صاحب! یہاں سوال یہ نہیں کہ میں نے پولیس کو رپورٹ کیوں نہ دی۔ میں نے آپ کو اپنا ایک دشمن بتایا ہے۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ رات کو ابرار حسین اور خدیجہ کے آدمی مجھے قتل کرنے آئے لیکن میری جگہ میرا بھائی سویا ہوا تھا۔ وہ جلدی جلدی میں میرے دھوکے میں میرے بھائی کو قتل کر گئے۔ خدیجہ نے انہیں بتایا ہوگا کہ باہر کے دروازے کی چٹخنی اور زنجیر کھُل جاتی ہے۔ خدیجہ نے ہی انہیں بتایا ہوگا کہ میں کس کمرے میں سویا کرتا ہوں"۔

سجاد کی اس بات میں مجھے کچھ وزن نظر آیا۔ اگر سجاد نے جھوٹ بولا تھا تو بھی میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ میں ابرار حسین اور خدیجہ کو شاملِ تفتیش کروں۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں نے تین مخبروں سے اس واردات کے متعلق رپورٹیں لی تھیں۔ سب نے سجاد کو بے اعتبار اور بُرا آدمی کہا اور مقتول کی سادگی اور شرافت کی تعریف کی۔ میں نے رات کو ہی اپنا ایک کانسٹیبل ابرار حسین کے گاؤں اس کام کے لیے بھیج دیا کہ پہلے وہاں کے نمبردار سے ملے اور اُسے کہے کہ ابرار حسین اور اُس کے پاس خدیجہ نام کی جو عورت ہے انہیں تھانے میں حاضر کرے۔ سجاد کو میں نے حوالات میں بند کر دیا۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ اُس گاؤں کا نمبردار ابرار حسین اور خدیجہ کو لے کر آ گیا۔ میں خدیجہ کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ پہلے اُس کی صرف فوٹو دیکھی تھی۔ اُس میں معلوم نہیں کیا کشش تھی کہ میں اُسے کچھ دیر دیکھتا ہی رہا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اُس کے چہرے پر ذرا سی بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ ابرار حسین تیس بتیس سال کی عمر کا جوان آدمی تھا اور وہ صحیح معنوں میں ایک خوبصورت جوان تھا۔ اُس کی خوبصورتی میں مجھے خاص قسم کی مردانگی دکھائی دے رہی تھی۔

"تمہارا نام خدیجہ ہے؟" ——— میں نے اُس لڑکی سے پوچھا ——— "اور تم ماسٹر خدا بخش کی بیٹی ہو جو یہاں پرائمری سکول میں پڑھاتا ہے؟"

"جی!"

"کیا تم سجاد ٹھیکیدار کی بیوی ہو؟" ——— میں نے پوچھا۔

"اب نہیں ہوں" ——— خدیجہ نے جواب دیا۔

"کیا تمہیں طلاق مل گئی ہے؟"

"زبانی طلاق مل گئی ہے" ——— خدیجہ نے کہا۔

"کیا سجاد نے تمہیں گھر سے نکال دیا تھا؟"

"نہیں" ——— خدیجہ نے جواب دیا ——— "وہ مجھے دھوکے

میں بے ہوشی کی دوائی پلا کر ریل گاڑی کی لائن پر لٹا آیا تھا۔"

میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میرا ردِّعمل کیا تھا۔ ایسے پتہ چلا جیسے مجھے بے خبری میں کسی نے پیچھے سے گردن پر گھونسہ مار دیا ہو۔ اگر اس لڑکی نے جھوٹ بولا تھا تو یہ بڑا دلچسپ جھوٹ تھا اور اگر اس نے سچ کہا تھا تو قتل کا یہ طریقہ بڑا دلچسپ تھا۔ کچھ دیر تک مجھ پر خاموشی طاری رہی۔ ابرار حسین اور نمبردار خدیجہ کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔

"ابرار حسین!" ——— میں نے کہا ——— "شکل و صورت سے تم عقل والے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اس لڑکی کو سمجھاؤ کہ یہ تھانہ ہے اور میں تھانیدار ہوں۔ یہاں جو بھی بات کرے سوچ سنبھل کر کرے۔"

"مجھے معلوم ہے جی کہ یہ تھانہ ہے" ——— خدیجہ نے بڑی دلیری سے کہا ——— "میں اس لیے کھُل کر بات کر رہی ہوں۔ جو مجھ پر بیتی ہے، اللہ اس سے میرے دشمن کو بھی بچائے۔ مجھے معلوم ہے میرے خاوند نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں اپنے کسی یار کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہوں۔ اگر میں گھر سے بھاگتی تو اس شخص کا خانہ خراب کر کے گھر سے نکلتی اور کچھ نہیں تو اپنا زیور تو ضرور ساتھ لے جاتی۔"

"جنابِ عالی!" ——— ابرار حسین نے کہا ——— "یہ جو کچھ کہہ رہی ہے بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اگر اس لڑکی کا کوئی جرم ہے تو آپ مجھے گرفتار کر لیں لیکن میری یہ عرض مان لیں کہ اسے اور مجھے بولنے کا پورا موقع دیں۔"

"فکر نہ کرو ابرار حسین!" ——— میں نے کہا ——— "میں جو کارروائی بھی کروں گا قانون کے دائرے میں رہ کر کروں گا۔ میں نے تم دونوں کو کسی اور سلسلے میں بلایا ہے۔"

میں نے اُن سے باقاعدہ پوچھ گچھ شروع نہیں کی تھی، نہ ہی یہ تفتیش کا طریقہ تھا کہ اکٹھے تین آدمیوں کو سامنے کھڑا کر کے میں سوال و جواب شروع کر دیتا۔ ابرار حسین اور نمبردار کو میں نے باہر بیٹھنے کو کہا اور خدیجہ کو اپنے

پاس بٹھالیا۔

میں نے کہا، دیسی میم نہیں بنوں گی

"دیکھو خدیجہ!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "یہاں جو بھی بات کرو، یہ سوچ کر کرو کہ یہ تھانہ ہے اور یہاں تمہارا ایک ایک لفظ لکھا جائے گا۔ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ میرے خاوند کا چھوٹا بھائی قتل ہو گیا ہے" ـــــ خدیجہ نے کہا ـــــ "میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ مجھے ابرار حسین نے راستے میں کہا تھا کہ تھانیدار صاحب نے اگر موقع دیا تو انہیں ساری بات سنا دینا۔"

میں نے یہ سوچا کہ پہلے میں اسے بولنے کا موقع دوں اور دیکھوں کہ یہ کیا کہتی ہے اور اس میں جھوٹ کتنا اور سچ کتنا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اپنی بات بعد میں کروں گا۔ پہلے تم بولو اور مجھے بتاؤ کہ تم نے یہ کیا کہا تھا کہ تمہارا خاوند تمہیں بے ہوش کر کے ریلوے لائن پر ڈال آیا تھا۔

"اللہ کے کام نرالے ہوتے ہیں تھانیدار صاحب جی!" ـــــ خدیجہ نے کہا ـــــ "میرا باپ غریب آدمی ہے۔ اُس نے پیسے کے لالچ میں آکر میری شادی اس آدمی کے ساتھ کر دی جو پہلی بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور دوسری بیوی کو اس نے زہر دے کر مارا تھا۔ پانچ چھ مہینے یہ شخص میرے ساتھ ٹھیک ٹھاک رہا لیکن میرے لیے یہ آدمی ٹھیک نہیں تھا۔ اس میں صرف ایک خوبی ہوتی تو میں اسی کے پیچھے اسے دل سے قبول کر لیتی۔ مجھے یہ گڑیا بنا کر رکھنا چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ میں محلے اور برادری کے لوگوں کے ساتھ اس طرح بات کیا کروں جیسے ہم بادشاہ ہیں اور وہ سب ہمارے غلام۔ یہ مجھے شہر لے گیا اور وہاں طرح طرح کے آدمیوں کے سامنے میری نمائش کرتا رہا۔ مجھے کہتا تھا کہ یہ شہر میں کوٹھی بنائے گا اور مجھے [illegible] بنا کر رکھے گا۔ اُس نے مجھے یہ بھی

کہا کہ میں افسروں کے ساتھ اُٹھا بیٹھا کروں . . . .

"میں نے اُسے صاف کہہ دیا کہ میں جس طرح اپنے ماں باپ کے گھر میں تھی اسی طرح اس گھر میں رہوں گی اور میں افسروں سے ملنے والی دیسی میم نہیں بنوں گی۔ اس نے مجھے یہ الفاظ کئی بار کہے کہ تم اب غریب ماں باپ کی بیٹی نہیں، ایک امیر آدمی کی بیگم ہو . . . . میں اپنی اصلیت کو نہیں بھولنا چاہتی تھی۔ ایک رات میرے خاوند نے مجھے شراب پینے کو کہا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شراب پیتا ہے لیکن باہر کہیں پیتا تھا۔ اُس رات اِس نے بوتل اور گلاس میرے آگے رکھ دیئے اور ضد کرنے لگا کہ میں پیئوں۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اپنا ایمان برباد نہیں کروں گی . . . . .

"اس کے چال چلن کا مجھے مزید پتہ چلا۔ یہ طوائفوں کے پاس جاتا تھا۔ شہر کا کوئی آدمی اس شخص کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی دوستی نو عمر سے دو خوبصورت لڑکوں کے ساتھ ہے۔ انہیں یہ خوب کھلاتا پلاتا ہے۔ میرے ساتھ اس کا لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہ کچے دل کا آدمی ہے۔ اندر سے کھوکھلا ہے۔ میرے دل میں اس کے خلاف حقارت پیدا ہو گئی۔ اُس نے کئی بار کہا کہ بچہ ہونا چاہیے۔ میں نے اسے ایک روز صاف کہہ دیا کہ تم بچہ پیدا کرنے کے قابل ہی نہیں ہو۔ ایک روز پھر اس کے ساتھ میری لڑائی ہو گئی۔ اس نے مجھے طلاق کی دھمکی بھی دی اور بیہودہ بکواس کی۔ میں نے اسے کہا کہ میں اس گھر سے نہیں نکلوں گی اور اسے بدنام کر دوں گی . . . .

"مجھے محلے کی عورتوں نے بتایا تھا کہ اس کی پہلی بیویاں اس کے آگے دبی دبی رہتی تھیں اور یہ شیر ہو جاتا تھا۔ میں خدا کی ذات اور اپنے ماں باپ اور بھائی کے سوا کسی کے آگے دبنے والی نہیں۔ میری نیت صاف تھی۔ میں نے ایسی حرکت کبھی نہیں کی تھی کہ مجھے شرمسار ہونا پڑتا۔ میں نے گھر میں ایسا رویہ اختیار کر لیا کہ اس شخص کو اپنے پاؤں کے نیچے

رکھ لیا۔ اس آدمی کے پاس روپے پیسے کے سوا کچھ بھی نہ تھا جس سے وہ کسی کو اپنا دردمند بنا سکے۔ یہ ریت کا ٹیلہ ہے۔ میں نے اسے ڈانٹنا جھاڑنا شروع کر دیا۔"

میں نے اسے روک دیا اور ایک سوال پوچھا۔ خدیجہ نے ایسا جواب دیا کہ میری ہنسی نکل گئی اور میرے مُنہ سے کچھ الفاظ اُس کی تعریف میں بھی نکل گئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ اور زیادہ بے تکلّفی سے بولنے لگی۔

"میں آپ کو ایک بات بتاتی ہوں" ——— اس نے کہا ——— "لیکن مجھ پر کوئی شک نہ کرنا۔ خدا کی قسم، میں ایسی نہیں۔ ایک رات کا واقعہ ہے میں نے اُسے بہت پریشان کیا۔ پہلے تو اس نے میری منّت سماجت کی پھر خاوندوں والے رعب میں آگیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں طوائف نہیں ہوں اور میری ضرورت صرف پیسہ نہیں۔ تم میری فطرت کی کوئی ضرورت پُوری نہیں کر سکتے۔ . . . . .

"وہ غصّے میں آگیا۔ میں اُسے آپ کہا کرتی تھی۔ پانچ چھ مہینوں سے میں اُسے تم کہہ کر بات کرتی تھی۔ اُس رات یہ میرے ساتھ گرما گرمی کرنے لگا تو میں نے اُسے کہا ——— 'میں آج پہلی بار تمہیں صاف بتا رہی ہوں کہ دو آدمیوں کے ساتھ میری درپردہ دوستی ہے۔ اگر میرے ساتھ تین پانچ کرو گے تو میں ان دونوں سے کہہ کر تمہارا حُلیہ بگاڑ دوں گی' ——— میرے خاوند نے بڑی زور سے کہا ——— 'تم مجھے قتل کراؤ گی' ——— میں نے بڑے آرام سے کہا ——— 'نہ جی، قتل کیوں کراؤں گی۔ تمہاری صرف کلف اُتروا دوں گی۔ ہفتے میں ایک بار تمہیں پھینٹی لگے گی اور تمہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ پھینٹی لگانے والا کون ہے' ——— مجھے ڈر تھا کہ یہ آخر میرا خاوند ہے، میرے منہ پر تھپّڑ جڑ دے گا اور مجھے طلاق کی دھمکی دے گا لیکن اس کی حالت ایسی ہوگئی جیسے مر گیا ہو . . . . . میری کسی سے بھی دوستی نہیں تھی۔"

خدیجہ ہنسنے لگی اور کچھ دیر ہنستی ہی رہی۔ وہ شاید بھول گئی تھی کہ وہ

تھانے میں بیٹھی ہے اور تھانیدار کو بیان دے رہی ہے۔ اُس وقت تک مجھے بہت تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ میں انسانوں کے چہرے پہچاننے اور باتیں کرنے کے انداز کو سمجھنے لگا تھا۔ خدیجہ کا جو انداز تھا یہ مجرمانہ انداز نہیں ہوتا۔ ایسی عورت شاذ و نادر ہی جھوٹ بولا کرتی ہے۔ وہ مجھے بیان اس طرح دے رہی تھی جیسے اپنی سہیلی کو اپنی آپ بیتی سُنا رہی ہو۔ اُس کی بے تکلّفی کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں اُسے داد دیتا چلا جا رہا تھا اور میں ہنس بھی پڑتا تھا۔

"تم نے کہا ہے کہ تمہاری دوستی کسی کے بھی ساتھ نہیں تھی" ——— میں نے کہا ——— "پھر ابرار کے ساتھ دوستی کس طرح ہوگئی؟"

"ابرار کے ساتھ میری دوستی بالکل نہیں تھی" ——— خدیجہ نے جواب دیا ——— "میں تو اسے جانتی ہی نہیں تھی . . . . . یہی تو میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں ابرار حسین کے پاس کس طرح پہنچی تھی . . . . . بات یوں ہوئی کہ میں نے اپنے خاوند سجّاد کو اپنے دو فرضی دوستوں کی دھمکی دی تو اُسے چُپ لگ گئی۔ پندرہ بیس دنوں بعد اُس نے مجھ سے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا کہ وہ دو آدمی کون ہیں۔ میں نے اُسے ٹال دیا۔ کچھ دنوں بعد اُس نے منّت کی کہ میں اپنے دل میں اُس کی محبت پیدا کروں۔ میں نے اُسے کہا کہ اُسے میں محبّت کے قابل سمجھتی ہی نہیں . . .

"میں اُس کی بیوی تھی۔ وہ مجھ سے دُور نہیں رہ سکتا تھا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری طبیعت غصیلی ہوگئی۔ میرے خون میں گرمی رہتی تھی اور یہ گرمی میرے دماغ کو چڑھتی تھی۔ مجھے نہایت معمولی سی بات پر بھی غصّہ آجاتا تھا۔ میرے خاوند نے میرے ماں باپ کو بتایا کہ میں اُس کے ساتھ لڑتی جھگڑتی ہوں اور ہر وقت غصّے سے بھری رہتی ہوں۔ ماں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے ماں کو وجہ بتا دی . . . . .

نشے میں چل پڑی

"اب میں آپ کو ایسی بات سنانے لگی ہوں جسے آپ شاید سچ نہیں مانیں گے۔ میرے سر پر قرآن رکھ دیں۔ میں خدا سے ڈرنے والی لڑکی ہوں۔ اللہ مجھے اس دنیا میں جھوٹ کی سزا دے .... یہ واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک رات اُس نے مجھے کھانے کے دوران کہا وہ مجھے کافی پلائے گا۔ اُس روز وہ شہر گیا تھا اور وہاں سے دو چھوٹے چھوٹے بند ڈبے لایا تھا۔ ایک میں میٹھا دودھ تھا اور دوسرے میں کافی۔ میں نے کافی سُنی تھی، پی کبھی نہیں تھی ....

"کھانے کے بعد وہ خود باورچی خانے میں کافی بنانے چلا گیا اور دو پیالیاں کافی بنا کر لے آیا۔ اُس رات وہ بہت ہی دبا دبا تھا۔ اُس نے ایک پیالی میرے ہاتھ میں دی۔ میں نے کافی چکھی تو اچھی لگی۔ اس میں ذرا سی کڑواہٹ تھی۔ میں نے اُسے بتایا تو وہ دوڑ کر میٹھے دودھ کا ڈبہ اُٹھا لایا۔ یہ بڑا گاڑھا دودھ تھا اور بہت ہی میٹھا۔ اُس نے تھوڑا اور دودھ میری پیالی میں ڈال دیا جس سے کافی میٹھی اور زیادہ اچھی ہو گئی ....

"مجھے یاد نہیں کہ میں نے پوری پیالی پی تھی یا نہیں۔ میں آہستہ آہستہ پی رہی تھی اور مجھے نیند آنے لگی تھی۔ جب میں بیدار ہوئی، یا یہ کہہ لیں کہ مجھے جب ہوش آئی تو میں پلنگ سے اُسی طرح اٹھی جس طرح ہر روز اُٹھا کرتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم اتنا زیادہ تھکا ہوا ہے کہ میرے پٹھے اکڑے ہوتے ہیں اور سر اتنا بوجھل کہ سنبھالا نہیں جاتا تھا۔ دماغ پوری طرح بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ یہ میرا گھر نہیں اور یہ پلنگ میرا نہیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ کسی اور کا گھر تھا۔ اسی کمرے میں سے ایک آدمی اُٹھ کر میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ یہ ابرار حسین تھا۔ میں اتنی زیادہ ڈری کہ میرے منہ سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ مجھے یاد آیا کہ مجھے خاوند

نے کافی پلائی تھی۔ مجھے یہ خیال نہ آیا کہ کافی میں بے ہوش کرنے والی کوئی دوائی ملی ہوئی تھی۔"

خدیجہ نے بڑی لمبی بات سُنائی جو میں مختصر کر کے اپنے الفاظ میں سُناتا ہوں۔ ابرار حسین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ خدیجہ کو وہ غنڈہ، بدمعاش اور ڈاکو نہیں لگتا تھا لیکن وہ ابرار سے بہت ڈر رہی تھی۔

"اپنا دل مضبوط کرو" —— ابرار نے خدیجہ سے کہا —— "تم میرے گھر میں ہو جہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہو۔ جہاں کہو گی وہاں پہنچا دوں گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور کہاں کی رہنے والی ہو .... گھبراؤ نہیں خدا نے تمہیں بچا لیا ہے۔ پہلے میں تمہارے لیے دودھ منگوا لوں۔ بے فکر رہو۔"

ابرار نے باہر جا کر کسی کو آواز دی اور کچھ دیر بعد کمرے میں آیا۔ اُس کے ہاتھ میں چینی کا بڑے سائز کا پیالہ تھا جو اُس نے خدیجہ کو دے کر کہا کہ دودھ ہے۔ خدیجہ نے دودھ پی لیا اور اُس کے جسم اور دماغ میں جان آنے لگی۔ اس دوران ابرار حسین اُس کے ساتھ تسلّی دلاسے اور حوصلہ افزائی کی باتیں کرتا رہا۔ خدیجہ کا خوف تو کم ہو گیا لیکن پریشانی کم نہ ہوئی۔

"یہ تو میں بتا دوں گی کہ میں کون ہوں" —— خدیجہ نے دودھ پی کر کہا —— "مجھے یہ بتا دو کہ میں کہاں ہوں اور یہاں کس طرح آ گئی ہوں!"

"تم شاید شہر (قصبے) کی رہنے والی ہو" —— ابرار حسین نے اُسے بتایا —— "رات کو تم ریلوے لائن سے اُٹھ رہی تھیں۔ دو آدمی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ اس وقت پُورا چاند چمک رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ریلوے لائن پر کوئی لیٹا ہوا ہے۔ وہ آدمی آگے آئے تو تم اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ انہوں نے تم سے پوچھا کہ یہاں کیوں لیٹی ہو۔ تم نے ایسی آواز میں کہا کہ مجھے نیند آ رہی ہے جیسے تم نیند میں بول

ہی تھیں۔ انہوں نے تمہیں اٹھایا اور تم آہستہ آہستہ ان کے ساتھ چل پڑیں۔ وہ تم سے پوچھتے تھے کہ تم کہاں کی رہنے والی ہو اور لائن پر کیوں لیٹی ہوئی تھیں۔ تم خواب میں بڑبڑانے کے لہجے میں کچھ نہ کچھ جواب دیتی تھیں....

"شہر سے تھوڑی دُور آن کراِن آدمیوں نے دیکھا کہ تم اچھی طرح چل نہیں سکتیں تو ایک نے تمہیں اپنی پیٹھ پر اُٹھا لیا، پھر دونوں باری باری تمہیں اُٹھا کر میرے پاس لے آئے۔ یہ گاؤں شہر سے چار سوا چار میل دُور ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ یہ دونوں میرے آدمی تھے اور تمہیں میرے ہاں لے آئے ہیں۔ تم آدھی رات کے وقت کی یہاں ہو اور اب دن کا تیسرا پہر گزر رہا ہے۔ اپنا آپ اچھی طرح دیکھ لو۔ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی، کوئی بدتمیزی ہوئی ہے یا نہیں۔ تم امانت ہو.... اب بتاؤ تم کون ہو۔ مسلمان ہو؟ کیا تم خودکشی کے لیے لائن پر لیٹی ہوئی تھیں؟ تم نے شاید کوئی زہریلی چیز کھائی تھی۔"

خدیجہ نے اُسے بتایا کہ وہ مسلمان ہے اور اُس نے خودکشی کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس نے ابرار کو پوری تفصیل سے بتایا کہ وہ کون ہے۔ کس کی بیٹی اور کس کی بیوی ہے اور اس کا خاوند کیسا آدمی ہے۔ اُس نے خاوند کے ساتھ اپنے تعلقات اور لڑائی جھگڑے بھی بتائے اور آخر میں بتایا کہ اُس کے خاوند نے اُسے کافی پلائی تھی۔ ابرار کو معلوم نہیں تھا کہ کافی کیا ہوتی ہے۔ اُس وقت دیہات میں چائے کا رواج تھا۔ وہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ کافی کے نام سے بھی لوگ واقف نہیں تھے۔

"اگر میری عقل کام کرتی ہے" ——— ابرار حسین نے کہا —"تو میں کہوں گا کہ خاوند نے تمہیں قتل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ کافی میں بے ہوش کرنے والی کوئی چیز ڈال کر تمہیں بے ہوش کیا اور لائن پر لٹا آیا تاکہ تمہارے اُوپر سے گاڑی گزر جائے۔ خدا کو ابھی تمہارا زندہ رہنا منظور تھا!"

ابرار حسین نے کوئی بڑی گہری بات نہیں کی تھی۔ خدیجہ نے اُسے

سنایا تھا کہ اس نے اپنے خاوند کو کس طرح تنگ اور پریشان کیا تھا۔ خدیجہ نے بھی یہی کہا کہ خاوند نے اسے قتل کرنا چاہا تھا۔ ابرار حسین نے اُس سے پوچھا کہ وہ اپنے خاوند کے پاس جانا چاہتی ہے؟ خدیجہ ابھی اچھی طرح سوچ نہیں سکتی تھی۔ کہنے لگی کہ اُس کا سر دُکھ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے تو سر پھٹنے لگتا ہے۔

"دل سے یہ غم اور اندیشہ نکال دو کہ یہاں تمہارے ساتھ کوئی دھوکہ ہوگا" ——— ابرار حسین نے اُسے کہا ——— "یہاں رہو۔ باہر آؤ۔ صحن میں گھومو پھرو۔ جب سوچنے کے قابل ہو جاؤ گی تو مجھے بتانا کہ کہاں جانا چاہتی ہو۔ میں اپنی گھوڑی پر بٹھا کر تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گا۔"

خدیجہ کو پھر غنودگی آنے لگی اور وہ لیٹ گئی۔ فوراً ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔

شریفوں کے ساتھ شریف۔ بدمعاشوں کے ساتھ...

رات بہت دیر سے اُس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی اور لالٹین کے پاس ایک ادھیڑ عمر عورت چارپائی پر بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔ خدیجہ اٹھ بیٹھی۔ یہ عورت دوڑتی اُس کے پاس آئی۔ یہ ابرار حسین کی نوکرانی تھی۔ خدیجہ نے اس سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ ابرار کے متعلق بھی پوچھا۔ نوکرانی نے اُسے بتایا کہ ابرار حسین کوئی ڈاکو یا رہزن نہیں، بڑا امیر زمیندار ہے۔ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ اس کی ایک بڑی بہن ہے جو خاوند اور بچوں والی ہے۔ اُس کے سسرال تھوڑی دُور ایک گاؤں میں ہیں۔ ابرار اکیلا ہے۔ اس کا بھائی کوئی نہیں۔ سارا گاؤں اس کی عزت کرتا ہے اور گاؤں کے لوگ اس سے ڈرتے بھی ہیں۔

"اس کے بیوی بچے ہوں گے" ——— خدیجہ نے پوچھا۔

"نہیں" ——— نوکرانی نے جواب دیا ——— "اس نے شادی نہیں کی۔ گاؤں میں ایک سے ایک رشتہ موجود ہے۔ بڑے بڑے جاگیردار دل

نے اسے اپنی بیٹیوں کے رشتے پیش کئے تھے لیکن یہ کہتا ہے کہ جو لڑکی میرے دل کو اچھی لگے گی اُس کے ساتھ شادی کروں گا۔"

ابرار حسین بڑا خوبصورت جوان تھا۔ ہنس مُکھ اور ہر دلعزیز بھی تھا۔ نوکرانی نے خدیجہ کو اس سے زیادہ کچھ نہ بتایا۔ وہ باہر چلی گئی اور خدیجہ کے لیے کھانا لے آئی۔ خدیجہ نے کھانا کھا کر نوکرانی سے کہا کہ ابرار کو بُلا دے۔ نوکرانی نے اُسے بتایا کہ وہ یہ کہہ کر سو گیا تھا کہ وہ سو جائے تو اُسے کوئی نہ جگائے۔

خدیجہ کے سر میں جو گرانی اور دُکھن تھی وہ تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ اُسے اب نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے نوکرانی سے کہا کہ وہ اُس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرے۔ نوکرانی نے کہا کہ اُسے نیند آ رہی ہے۔ اُس نے خدیجہ سے یہ بھی کہا — "مجھے تم پر پہرہ دینے کے لیے اس کمرے میں نہیں بھیجا گیا۔ میں نوکرانی ہوں۔ میری ضرورت پڑے تو جگا لینا۔"

خدیجہ باقی رات سو نہ سکی۔ اُسے ڈر تھا کہ کسی بھی وقت ابرار یا کوئی اور آدمی آ کر اُسے پریشان کرے گا لیکن صبح ہو گئی۔ ابرار حسین آیا اور اُس نے خدیجہ کے ساتھ اس طرح باتیں کیں جیسے یہ لڑکی اُس کی معزز مہمان ہو۔ خدیجہ کے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا کہ وہ کیا کرے۔ یہ تو اُسے یقین ہو گیا تھا کہ خاوند نے اُسے کافی میں کچھ پلا دیا تھا۔ اُس نے ابرار سے کہا کہ وہ اپنے خاوند کے پاس چلی جاتی ہے اور اُس سے طلاق لے لے گی۔ ابرار نے عقل سے کام لیا۔ اُس نے خدیجہ سے کہا کہ پہلے شہر سے پتہ کرانا چاہیئے کہ سجاد اس سلسلے میں کیا کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اُس نے تھانے میں رپورٹ لکھوا دی ہو کہ اُس کی بیوی لاپتہ ہے۔

ابرار اور خدیجہ کیا سوچتے رہے اور خدیجہ کی جذباتی حالت کیا ہوتی رہی، اسے اگر پوری طرح سنانے لگوں تو مجھے پرچے کے پچاس صفحے درکار ہوں گے۔ آپ یہ ذہن میں رکھ لیں کہ اس قسم کی صورتِ حال کو سمجھنے اور اس میں کوئی فیصلہ کرنے کی اہلیت نہ ابرار میں تھی نہ خدیجہ میں۔ میں اس

سے آگے کہانی سناتا ہوں۔

خدیجہ تین چار روز ابرار حسین کے گھر میں رہی۔ وہاں ابرار حسین اور نوکرانی کے سوا کوئی نہیں آتا تھا۔ یہ مکان گاؤں سے ذرا باہر تھا اور اس کے اردگرد سبزیوں کا اور پھلدار درختوں کا باغ تھا۔ ابرار کا بڑا مکان گاؤں کے درمیان تھا۔

خدیجہ نے ان چار پانچ دنوں میں دیکھ لیا تھا کہ ابرار اُس کے ساتھ وہ سلوک نہیں کرتا تھا جس کا اُسے ڈر تھا۔ راتوں کو ابرار اسی مکان کے کسی اور کمرے میں ہوتا تھا لیکن رات کو وہ خدیجہ کے کمرے میں نہیں آتا تھا۔ اگر اُسے بدنیتی کرنی ہوتی تو اُسے کون روک سکتا تھا۔

خدیجہ وہاں تنگ آ گئی۔ ایک روز اُس نے ابرار سے کہا کہ وہ کب تک اس طرح پڑی رہے گی۔ اُس نے اپنے ماں باپ کے پاس چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ ابرار حسین اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

خدیجہ!" — اُس نے درخواست کرنے کے لہجے میں کہا —

"تم اتنے دنوں سے میرے گھر میں ہو۔ اب تمہیں مجھ پر یہ شک نہیں کرنا چاہیئے کہ میں بُری نیت اور غلط ارادے کا مالک ہوں۔ آج میں اپنا دل کھول کر تمہیں دکھاتا ہوں کسی دن میری بڑی بہن تمہیں دیکھنے آئے گی۔ میں نے تمہیں یہاں چھپا کر نہیں رکھا ہُوا۔ تم میرے متعلق میری بہن سے پُوچھنا۔ گاؤں کے کسی آدمی اور کسی بھی عورت سے میرے متعلق پُوچھنا۔ میری عمر تیس سے دو سال اوپر ہو گئی ہے۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ بڑے اچھے اور امیر خاندانوں کے پیغام آئے۔ ان میں دو تین لڑکیاں بہت خوبصورت تھیں لیکن میں نے ان میں سے کسی کو بھی قبول نہ کیا۔ میرے متعلق مشہور ہو گیا کہ اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا یہ کسی ایسی لڑکی کو چاہتا ہے جس کا رشتہ اسے نہیں مل سکتا ....

"نہیں خدیجہ! میں جس لڑکی کو چاہتا ہوں، وہ میں سمجھتا تھا کہ ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ مجھے ایسی بیوی چاہیئے جو میرے دل اور میری پسند

کے مطابق خوبصورت ہو اور جو مجھے رُوح کی محبت دے سکے۔ ماں کے مرنے کے بعد میں محبت اور پیار کے لیے ترس گیا ہوں۔ ایک بڑی بہن ہے، وہ مجھے ماں کا پیار دیتی ہے۔ میں اُس کی ہر بات کو حکم سمجھتا ہوں۔ مجھے بیوی بھی ایسی ہی چاہیئے۔ میری ماں بہت خوبصورت عورت تھی...

"تم جب میرے سامنے آئیں تو میرے دل نے کہا کہ یہ ہے وہ لڑکی جس کے انتظار میں تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم چلی جاؤ گی تو میں بتا نہیں سکتا کہ میرا کیا حال ہوگا۔ میں نے تمہیں امانت سمجھ کر رکھا ہے۔

دیکھ لو، میں نے خیانت نہیں کی۔ اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی تو میں تمہیں روکوں گا نہیں....

"تم نے مجھے اپنے خاوند کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔ تم نے اُسے قبول نہیں کیا اور اُس نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر تم مجھے قبول کر لو تو میں تمہارے خاوند سے تمہاری طلاق لے سکتا ہوں۔ میں اپنے متعلق اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ میں شریفوں کے ساتھ شریف اور بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش ہوں۔ کئی بدمعاش میرے ہاتھ میں ہیں۔ میرے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔"

خدیجہ نے مجھے بتایا کہ ابرار پہلے ہی اُس کے دل کو اچھا لگ رہا تھا۔ اُس نے ابرار کا اخلاق دیکھ لیا تھا۔ ابرار نے اُسے پناہ میں لیا تھا۔ وہ تو بُری طرح خوفزدہ تھی۔ اس سے پہلے اُس نے ازدواجی زندگی کی تلخیاں برداشت کی تھیں۔ ابرار نے جس لہجے میں اُس کے ساتھ محبت کا اظہار کیا، وہ اُس کے دل میں اُتر گیا۔ اُس نے ابرار کی محبت کو دل سے قبول کر لیا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ پیچھے شہر میں میرے متعلق کیا باتیں ہو رہی ہوں گی" ——— خدیجہ نے کہا ——— "میں اپنے ماں باپ اور بھائی سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہارے ساتھ چوروں کی طرح شادی نہیں کروں گا" ——— ابرار

نے کہا ——— "میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا کہ تم ماں باپ کی اجازت کے بغیر میرے ساتھ شادی کر لو، لیکن یہ سوچ لو کہ تمہارا شہر جانا ٹھیک نہیں۔ اگر تمہارے خاوند نے تمہیں بے ہوش کر کے ریلوے لائن پر لٹا دیا تھا تو دوسرے دن اُس نے ضرور دیکھا ہوگا کہ تم گاڑی کے نیچے کٹ چکی ہو۔ اُس نے جب دیکھا ہوگا کہ تم لاپتہ ہو تو معلوم نہیں اُس نے کیا کیا ہوگا اور لوگوں سے کیا کہا ہوگا۔"

دونوں نے سوچ سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ پہلے خدیجہ کے بھائی کو یہاں بُلایا جائے اور شہر میں کسی کو پتہ نہ چلے۔ ابرار حسین نے خدیجہ سے کہا کہ اس کے ہاتھ میں بڑے پکے اور سیانے آدمی ہیں۔ ان میں سے جسے بھی بھیجا وہ خدیجہ کے بھائی کو بُلا لائے گا۔ دوسرے دن ایک آدمی کو بھیج دیا گیا۔ خدیجہ نے اُسے اپنے باپ کا نام اور گھر کا اتا پتہ بتا دیا تھا۔

ایک خطرہ اور بھی تھا

خدیجہ کا بھائی شام کے بعد ابرار کے پاس آیا۔ ابرار اُسے خدیجہ کے پاس لے گیا۔ خدیجہ نے مجھے بتایا کہ اُسے دیکھ کر اُس کے بھائی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ سمجھا ہوگا کہ خدیجہ ابرار کے ساتھ اپنے خاوند کے گھر سے بھاگ آئی ہے۔ اُس نے خدیجہ کے ساتھ حقارت سے بات کی۔ ابرار نے اُسے بتایا کہ خدیجہ اُس کے پاس کس طرح پہنچی ہے۔ خدیجہ نے اُسے بتایا کہ سجاد نے اُسے بڑی پیاری پیاری باتیں کرتے ہوئے کافی پلائی تھی۔ بھائی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اُس نے کہا ——— "اگلی صبح سجاد ہمارے گھر آیا اور پوچھا کہ خدیجہ ادھر آئی ہے؟ ہم نے کہا کہ ادھر نہیں آئی تو اُس نے کہا کہ رات کو معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے۔ ہم نے اُسے کہا کہ تھانے چلتے ہیں۔ سجاد کہتا تھا کہ تھانے جانا بیکار ہے، معلوم نہیں کس کے ساتھ چلی گئی ہے۔ امی جی اور ابا کے زور دینے پر وہ ہمارے ساتھ

تھانے چلا گیا لیکن اُس نے تھانیدار کو کہہ کہلا کر آبا جی اور امّی سے منوا لیا کہ رپورٹ نہیں لکھوانی چاہیئے۔ اُس نے آبا جی کو کچھ رقم دی تھی۔"

خدیجہ نے اپنے بھائی کے یہ الفاظ مجھے سنائے تو مجھے خیال آیا کہ سجّاد خدیجہ کی گمشدگی کی رپورٹ کیوں نہیں لکھوا رہا تھا۔

"اُس سے میرا زیور لیا ہے؟" —— خدیجہ نے بھائی سے پوچھا۔

"اُس نے زیور نہیں دیا" —— خدیجہ کے بھائی نے ابرار حسین سے کہا —— "چوہدری صاحب! سجاد کے پاس پیسہ ہے اور اُس کا افسروں کے ساتھ میل جول ہے۔ تھانیدار بھی اُسی کی مانتا ہے۔ ہم کسی کے محتاج تو نہیں لیکن ہم سجّاد سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ میرے ماں باپ رونے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکے۔"

"میری ایک بات دل میں بٹھا لو خدیجہ!" —— میں نے خدیجہ کی بات کاٹ کر کہا —— "میرے متعلق ایسا وہم نہ کرو کہ میں روپے پیسے والوں کا ساتھ دیتا ہوں۔ سجّاد حوالات میں بند ہے۔ چاہو تو دیکھ سکتی ہو۔"

وہ خوشی سے اُچھل پڑی۔ میں نے پہلے اُسے نہیں بتایا تھا کہ سجّاد حوالات میں ہے۔ اس اطلاع پر وہ اور دلیر ہو گئی اور اپنے بھائی کی باتیں سنانے لگی۔

"ہم تو چُپ ہو گئے، سجّاد نے تمہیں بدنام کرنا شروع کر دیا" —— خدیجہ کے بھائی نے اُسے سنایا —— "وہ ہر کسی کو کہتا پھرتا ہے کہ خدیجہ کے تعلقات معلوم نہیں کس کس کے ساتھ تھے اور وہ کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ مجھے اگر اپنے ماں باپ کا خیال نہ ہوتا تو میں سجّاد کو قتل کر دیتا۔۔۔۔ تھانے میں اُس نے کہا تھا کہ وہ تمہیں طلاق دے دے گا۔ اب وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ طلاق نہیں دوں گا، میں دیکھتا ہوں اس کے ساتھ کوئی کس طرح شادی کرتا ہے۔"

خدیجہ نے مجھے بتایا کہ اُسے اور ابرار حسین کو اب یقین ہو گیا تھا کہ سجّاد خدیجہ کو دھوکے سے بے ہوشی کی دوائی پلا کر اُسے ریلوے لائن پر لٹا آیا تھا۔

خدیجہ بھائی کی باتیں سُن کر اتنی بھڑکی کہ اُس نے ابرار سے کہا کہ وہ سجّاد سے انتقام لے گی۔ ابرار نے کہا کہ وہ انتقام نہیں، طلاق لے گا۔

ابرار حسین نے خدیجہ کے بھائی کی خوب خاطر تواضع کی اور خدیجہ کی موجودگی میں کہا کہ وہ خدیجہ کے ساتھ شادی کرے گا لیکن خدیجہ کے ماں باپ کی اجازت لے کر۔ اُس نے خدیجہ کے بھائی سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے ماں باپ کو یہاں بھیجے تاکہ اُن کا غم ختم ہو۔

خدیجہ نے بھائی کو پوری طرح مطمئن کر کے بھیجا۔

اگلے روز شام کے بعد خدیجہ کی ماں اور اُس کا باپ ابرار حسین کے ہاں آ گئے۔ اپنے بیٹے سے وہ سب کچھ سُن آئے تھے۔ بیٹا ان کے ساتھ آیا تھا۔ ابرار اور خدیجہ نے اُنہیں ایک بار پھر سنایا کہ اصل واقعہ کیا ہوا ہے۔ ماں باپ بہت روئے۔ وہ پچھتا رہے تھے کہ اُنہوں نے اپنی بیٹی کا رشتہ سجّاد کو دے دیا تھا۔ باپ نے بتایا کہ سجّاد نے اُسے دھمکی دی تھی کہ اُس نے خدیجہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی یا وہ تھانے گیا تو اُس کا انجام بہت بُرا ہو گا۔

یہاں میں اس قصے کو ذرا اور مختصر کر دیتا ہوں۔ خدیجہ کے ماں باپ بہت بُری حالت میں تھے۔ وہ سجّاد سے ڈرتے تھے اور خدیجہ کے لاپتہ ہونے سے اُن کی رسوائی اتنی ہوئی تھی کہ اُنہوں نے لوگوں سے ملنا ملانا چھوڑ دیا تھا۔ باپ تو غم سے نڈھال تھا۔ برادری میں اچھے لوگ بھی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سجّاد نے خدیجہ کو خود غائب کیا ہے اور خدیجہ کا باپ ڈپٹی کمشنر کو درخواست دے کہ سجّاد کو حکم دیا جائے کہ وہ خدیجہ کو حاضر کرے۔

خدیجہ کا باپ اتنی ہمت والا آدمی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ لالچی تھا۔ اُس نے سجّاد سے رقم لے کر بیٹی کا رشتہ دیا تھا اور رقم لے کر رضامند ہوا تھا کہ خدیجہ کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھوائے گا۔

ابرار حسین نے اُنہیں بھی کہا کہ وہ خدیجہ کے ساتھ شادی کرے گا۔

خدیجہ کے ماں باپ خوش تو ہوئے لیکن انہوں نے مشکل یہ بیان کی کہ سجّاد طلاق نہیں دے گا۔

ابرار نے خدیجہ کے باپ سے کہا ——"چچا جان! مسئلہ صرف طلاق لینے کا نہیں۔ مسئلہ بلکہ خطرہ ایک اور بھی ہے۔ سجّاد کو جب پتہ چلے گا کہ اپنی جس بیوی کو وہ بے ہوش کر کے ریلوے لائن پر لٹا آیا تھا، وہ میرے پاس ہے تو اُسے اپنا جُرم چھپانے اور خدیجہ کو رُسوا کرنے کا بڑا اچھا موقع مل جائے گا۔ وہ تھانے میں رپورٹ لکھوائے گا کہ اس کی بیوی گھر سے رقم اور زیور چوری کر کے بھاگ گئی ہے اور وہ فلاں آدمی کے گھر میں ہے۔ . . . میں اس خطرے سے بچنے کا بھی بندوبست کرلوں گا۔ اگر میں نے خدیجہ کو آپ کے ساتھ بھیج دیا تو سجّاد اسے پکڑوا دے گا اور آپ بھی پکڑے جائیں گے۔ آپ چُپ رہیں۔ میرے لیے دُعا کریں کہ خدا میری مدد کرے"۔

ابرار حسین نے خدیجہ کے ماں باپ اور بھائی کو رات اپنے ہاں مہمان رکھا اور صبح واپس بھیجا۔

بول ہیجڑے، کچھ بول

خدیجہ کے بیان پر کبھی مجھے شک بھی ہونے لگتا تھا۔ ابھی مجھے ابرار حسین کا بیان بھی لینا تھا۔ میں نے کہا ہے کہ خدیجہ کا انداز ایسا تھا کہ میں اُس کے بیان کو سچ سمجھ رہا تھا لیکن اُس کی ہر بات سچ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تو فلمی ڈرامہ معلوم ہوتا تھا۔ آگے چل کر مجھے شک ہونے لگا کہ یہ تو ہے ہی فلمی ڈرامہ۔

خدیجہ بولتے بولتے چُپ ہو گئی۔ میرا خیال ہے اُسے بولتے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔

"میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں" ——— اُس نے کہا ——"آپ

مان لیں۔ دو واقعات ایسے ہیں جو ابرار حسین سے سُنیں تو بہتر ہوگا۔ یہ میں بھی سُنا سکتی ہوں لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو ابرار کو ہی معلوم ہیں"۔

مجھے اُس کی یہ بات ماننی نہیں چاہیئے تھی۔ پوچھ گچھ کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہوتا لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ باقی واقعات ابرار سے سنوں گا۔ اس کے بعد خدیجہ کو بُلا کر یہی واقعات اس سے سنوں گا اور دیکھوں گا کہ دونوں کے بیانات میں کیا فرق ہے۔

میں نے خدیجہ کو باہر بھیج کر ابرار حسین کو بلایا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ابرار حسین بڑا خوبصورت جوان تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ خدیجہ اُس کے پاس کس طرح پہنچی تھی۔ اُس نے وہی بیان دیا جو خدیجہ دے چکی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ دو آدمی کون ہیں جو خدیجہ کو لائن پر سے اُٹھا لائے تھے۔ اُس نے دونوں آدمیوں کے نام بتا کر کہا کہ وہ انہیں تھانے میں حاضر کرے گا۔

میں نے اُسی وقت ایک کانسٹیبل کو ابرار کے گاؤں بھیجا کہ وہ ان دو آدمیوں کو اور ابرار کی نوکرانی کو تھانے لے آئے۔

"کیا یہ جرم نہیں کہ ایک عورت کو یہ آدمی بے ہوشی کی حالت میں تمہارے پاس لے گئے اور تم نے اُسے اپنے قبضے میں رکھ لیا؟" —— میں نے کہا ——"وہ اُسے تھانے لے آتے۔ تم اُسے تھانے لے آتے"۔

"جرم ہے جناب!" ——— اُس نے جواب دیا ——"اگر لڑکی کہہ دے کہ میں نے اُسے ناجائز قبضے میں رکھا ہے تو مجھے گرفتار کر لیں۔ مجھے معلوم نہیں خدیجہ نے آپ کو کیا بتایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ لڑکی میرے پاس نہ آتی تو یہ ماری جاتی یا کسی غلط جگہ پہنچ جاتی"۔

یہ بحث بعد کی بات تھی کہ ابرار یا اُس کے آدمیوں نے کوئی جرم کیا تھا۔ اُس وقت میرے سامنے سجّاد کے چھوٹے بھائی صادق کے قتل کی تفتیش تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا تھا کہ صادق کے قتل کے ساتھ خدیجہ کے واقعہ کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ میں اگر ابرار پر یہ بوجھ ڈالتا کہ

اُس نے خدیجہ کو اپنے پاس رکھ کر جُرم کیا ہے تو خطرہ تھا کہ یہ اپنے فائدے اور اپنے بچاؤ کو سامنے رکھ کر بیان دے گا۔ اس سے بیان لینے کا طریقہ یہ تھا کہ اسے بولنے دیا جائے۔

"خدیجہ نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ تمہارے پاس کس طرح پہنچی تھی"۔ میں نے کہا ——— "تم نے اچھا کیا ہے کہ ایک لڑکی کو بچا لیا ہے۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ سجّاد حوالات میں بند ہے۔ اسے میں نے اُس کے بھائی کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا ہے۔ اُس نے مجھے کہا ہے کہ تم اُس کے دشمن ہو۔ دشمنی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کی بیوی تمہارے پاس ہے"۔

"اگر میری دشمنی اُس کے ساتھ ہے تو مجھے اس کے بھائی کو قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" ——— ابرار حسین نے کہا ——— "میں قتل کر سکتا ہوں جناب! میں قتل کروا سکتا ہوں۔ اگر میں قتل کرنا چاہتا تو سجّاد کو کرتا۔ میں آپ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ نے سجّاد کو کیوں گرفتار کیا ہے۔ یہ آپ کا کام ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ نے اسے کچھ سوچ کر ہی گرفتار کیا ہو گا...... یہ شخص تو مجھ پر بھی وار کر چکا ہے۔ میں ابھی سوچ رہا تھا کہ اُس پر جوابی وار کروں یا نہ کروں"۔

میں یہ سُن کر حیران ہُوا کہ سجّاد نے ابرار پر بھی وار کیا ہے۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بڑی لمبی اور بڑی دلچسپ کہانی سُنا دی۔ یہ میں آپ کو اپنے الفاظ میں سُناتا ہوں۔

صادق کے قتل سے دس بارہ روز پہلے کا واقعہ ہے کہ ابرار کے اسی مکان میں جو سبزیوں اور پھلوں کے باغ کے اندر تھا، ایک روز تین آدمی آئے۔ اُن کے پاس دو شکاری بندوقیں تھیں اور انہوں نے بندوقوں سے مارے ہوئے کچھ پرندے اُٹھا رکھے تھے۔ ان میں ایک آدمی کی حالت کچھ بگڑی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھیوں نے ابرار کو بتایا کہ وہ شکار کو نکلے تھے۔ اس گاؤں سے ذرا آگے گئے تو ان کے اس ساتھی کو چکر آ گیا اور وہ گر پڑا۔ وہ اپنے اس ساتھی کو پانی وغیرہ پلانے اور ذرا

آرام کے لیے ابرار کے گھر لے آئے تھے۔ ابرار کا یہ مکان گاؤں سے باہر تھا اور ان شکاریوں کے راستے میں آتا تھا اس لیے وہ اِدھر ہی آ گئے۔

ابرار نے اپنے نوکروں کو بلایا اور برآمدے میں پلنگ بستر بچھوا کر اس آدمی کو لٹا دیا اور اس کے لیے دودھ وغیرہ کا انتظام کیا۔ اُس وقت تک یہ شخص خاصا سنبھل چکا تھا۔ اُس نے کہا کہ اب وہ بہتر محسوس کر رہا ہے۔ تھوڑا سا پانی پی کر طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ ابرار نے ان شکاریوں سے کہا کہ وہ انہیں کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دے گا۔ یہ تینوں شکاری ابرار حسین کے لیے اجنبی تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ وہ اُس قصبے کے رہنے والے ہیں۔

ابرار اپنی نوکرانی کو کھانے کے متعلق کہنے کے لیے اندر گیا۔ اُس نے خدیجہ کو بتایا کہ تمہارے شہر کے تین شکاری آئے ہیں جن میں ایک کو کچھ تکلیف ہو گئی ہے۔ خدیجہ نے کواڑ ذرا سا کھول کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے شہر کے آدمیوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ ابرار اُس کے قریب ہی کھڑا ہنس رہا تھا کہ تھوڑا سا پیدل چلنے سے شہری بابو کو چکر آ گیا ہے۔

"ابرار!" ——— خدیجہ نے دروازہ بند کر کے ابرار سے قدرے گھرائی ہوئی آواز میں کہا ——— "یہ مردود جو پلنگ پر بیٹھا ہے میرا خاوند ہے، سجاد۔ یہ شکار کا شوقین ہے۔ یہ جو دو آدمی اس کے ساتھ ہیں، یہ اس محکمے کے افسر ہوں گے جہاں سے اُسے ٹھیکے ملتے ہیں" ——— خدیجہ کے چہرے کا رنگ یک لخت یوں بدل گیا جیسے اُسے بھی چکر آنے لگا ہو۔ اُس نے ابرار کی کلائی پکڑ لی اور بولی ——— "اسے اندر لاؤ، کسی بہانے سے اندر لے آؤ"۔

ابرار سوچ میں پڑ گیا۔ خدیجہ نے اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہا۔ "اسے اندر لے آؤ ابرار! میں اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتی ہوں"۔

"بس اسے لے آتا ہوں" ——— ابرار نے کہا ——— "لیکن زبان سے کام لینا۔ ایسا نہ کرنا کہ کوئی چیز اُٹھا کر اُس کے سر پر دے مارو"۔

"ہاں ہاں" ——— خدیجہ نے کہا ——— "میں اُسے صرف اتنا کہنا
چاہتی ہوں کہ تم مرد ہوتے تو مجھے قتل کر کے میری لاش غائب کر دیتے ۔
تم نے بزدلوں کی طرح مجھے دھوکے میں بے ہوشی کی دوائی پلا دی اور مجھے
ریلوے لائن پر پھینک آئے ۔ یہ دیکھ لو ۔ میں تمہارے سامنے زندہ کھڑی
ہوں ۔

ابرار باہر گیا اور سجاد سے کہنے لگا ——— "میں نے آپ کے لیے غسلخانے
میں پانی رکھوا دیا ہے ۔ آپ نہالیں ۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی ۔"
سجاد کو اُس کے ساتھیوں نے بھی کہا کہ وہ نہالے ۔ وہ اُٹھا اور ابرار
کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا ۔ ابرار اُسے ایک کمرے میں لے گیا ۔ کمرے میں
خدیجہ کھڑی تھی ۔ ابرار نے مجھے بتایا کہ اُس نے جب خدیجہ کو دیکھا اس وقت
ابرار سجاد کو دیکھ رہا تھا ۔ سجاد کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا اور کھڑے
کھڑے وہ ذرا سا ڈول گیا اور اس کا ایک پاؤں پیچھے ہو گیا ۔ ابرار اُس کے
قریب ہو گیا کہ یہ شخص چکرا کر گرے گا ۔ سجاد نے ابرار کی طرف دیکھا ۔ ابرار نے
مجھے بتایا کہ سجاد کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں ۔ یہ تو مجھے سجاد کی پہلی بیوی اور
خدیجہ بھی بتا چکی تھی کہ سجاد بزدل آدمی ہے ۔ ابرار نے اُسے کندھوں سے
تھام کر پلنگ پر بٹھا دیا اور خدیجہ سے کہا کہ وہ پانی لائے ۔ خدیجہ ابرار
کے کہنے پر پانی لے تو آئی لیکن اُس نے گلاس سجاد کو دینے کی بجائے
ابرار کی طرف بڑھایا ۔

"تم نہ کہتے تو میں اس کے لیے پانی نہ لاتی" ——— خدیجہ نے ابرار
سے کہا ——— "تم اسے پانی دو ۔ میرے سامنے یہ شخص پیاسا مر رہا ہو
تو بھی میں اس کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ نہیں ڈالوں گی ۔"
ابرار نے مجھے بتایا کہ اسے توقع تھی کہ سجاد کچھ تو بولے گا لیکن اُسے
ایسی چُپ لگی رہی جیسے وہ مر گیا ہو ۔ اُس نے ابرار سے گلاس لے کر پانی پی لیا ۔
"تُو نے مجھے دھوکے میں بیہوش کیا" ——— خدیجہ نے سجاد سے
کہا ——— "تو مرد ہوتا تو ایک عورت پر ہاتھ نہ اٹھاتا ۔ تو نے ایک عورت کو

دھوکا دیا ۔ تجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ مجھے اپنے ہاتھوں قتل کر سکتا ۔ تجھ میں
دم خم ہوتا تو تین بیویوں میں سے کسی کے بچے کا باپ تو ہوتا ...... دیکھ!
یہ کھڑی ہے وہ عورت جسے تو بیہوش کر کے ریل کی پٹڑی پر پھینک آیا
تھا ۔"

سجاد پھٹی پھٹی نظروں سے خدیجہ کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی
جان نکل گئی ہو ۔

"مت ڈر بزدل!" ——— خدیجہ نے اپنے دونوں کولہوں پر
ہاتھ رکھ کر کہا ——— "میں تجھے قتل نہیں کراؤں گی اور میں تجھے جینے
کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گی ۔ تو شہر میں مجھے بدنام کرتا پھر رہا ہے کہ میں
کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوں ۔ جا تھانے میں جا کر رپورٹ لکھوا کہ میری بیوی
ابرار حسین کے پاس ہے ۔ پھر دیکھ میں تجھے ٹھیکیدار سے بھکاری کس طرح
بناتی ہوں"

ابرار نے مجھے بتایا کہ خدیجہ پر غصے اور جذبات کا ایسا غلبہ ہوا کہ
اُس کے آنسو بہہ نکلے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ——— "بول
ہیجڑے، کچھ بول ۔"
ابرار کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ سجاد نے التجا کے لہجے میں
ابرار سے کہا ——— "چوہدری صاحب! اسے کہیں مجھے معاف کر دے" ———
پھر اُس نے خدیجہ کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہنے لگا ——— "مجھے بخش
دو خدیجہ! میں غصے میں آکر وہ حرکت کر بیٹھا تھا ۔"
"تجھے تو خدا بھی نہیں بخشے گا" ——— خدیجہ نے کہا ——— "مجھے
طلاق نامہ لکھ کر دے دو ۔ میں زبانی طلاق کو نہیں مانوں گی ۔"
"اگر تم طلاق نامہ چاہتی ہو تو میں گھر جاتے ہی لکھ کر بھیج دوں گا ۔"
سجاد نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا ۔ کہنے لگا ——— "میں اب گھر جا رہا
ہوں ۔"
ابرار نے اُسے کہا کہ وہ کھانا کھلائے بغیر اُسے نہیں جانے دے

گا۔ ابرار نے یہ بھی کہا کہ وہ اُسے اپنی گھوڑی دے گا کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ پیدل چلنے کے قابل نہیں۔

"میں جانتی ہوں اس کی طبیعت کیوں خراب ہے" ——— خدیجہ نے طنزیہ لہجے میں کہا ——— "شراب اور بدکاری کا مارا ہوا یہ آدمی اسی طرح کہیں نالی میں گر کر مرے گا"

سجاد جب اس کمرے سے باہر آیا تو ابرار کو بازو سے پکڑ کر صحن میں لے گیا۔

"چوہدری ابرار!" ——— سجاد نے منت سماجت کے لہجے میں کہا ——— "میرے ساتھ دو سرکاری افسر ہیں۔ خیال رکھنا ان کے سامنے میری بے عزتی نہ ہو جائے۔ خدیجہ کے متعلق میں کچھ نہیں کہنا چاہتا، سوائے اس کے کہ یہ بڑی سخت طبیعت کی اور غصیلی عورت ہے میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ یہ تمہارے پاس کس طرح آئی ہے۔ خدا کے لیے میری عزت رکھنا"

"پرواہ نہ کر سجاد بابو!" ——— ابرار نے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر کہا ——— "طلاق نامہ بھیج دینا۔ پھر ہم تمہیں اپنی طرف سے بے فکر کر دیں گے"

"جناب ملک صاحب!" ——— ابرار نے مجھ سے کہا ——— "وہ دن اور آج کا دن سجاد نے طلاق نامہ نہیں بھیجا۔ اس سے طلاق نامہ لینے کے لیے میرے پاس اور طریقے بھی تھے۔ میرے متعلق میرے گاؤں سے پوچھنا۔ میرے ہاتھ میں ایسے آدمی ہیں جو اس شخص کو گھر سے اٹھا کر میرے پاس لے آتے اور اس کے جسم کا قیمہ کر کے مویشیوں کو کھلا دیتے لیکن میں معلوم نہیں کیوں چپ رہا۔ اس شخص نے میری چپ کو غلط سمجھ کر مجھ پر ایک اوچھا وار کیا" ——— ابرار یہ باتیں کرتے ہوئے جذباتی بھی ہو جاتا تھا۔

رات، خدیجہ اور ڈیوڑھی

ابرار نے ایک اور واقعہ سنا کر مجھے سر سے پاؤں تک ہلا دیا۔ یہ واقعہ سن کر میں نے سجاد کے متعلق یہ رائے قائم کی کہ یہ شخص سانپ ہے جو اپنے پالنے والے کو بھی ڈس لیتا ہے۔ واقعہ یوں ہوا کہ جس روز سجاد ابرار کے گھر گیا تھا، اس سے پانچ چھ روز بعد رات کے وقت ابرار کے اسی باغ والے مکان میں تین آدمی دیوار پھاند کر داخل ہوئے۔ اُن آدمیوں کو غالباً معلوم نہیں تھا کہ رات کو ابرار کے اس مکان کی ڈیوڑھی میں دو یا تین آدمی سویا کرتے ہیں۔ ابرار نے مجھے بتایا کہ اس کے یہ آدمی لٹھ باز بھی ہیں اور سنگین واردات کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ سب سے پہلے ابرار کی آنکھ کھلی۔ اُسے پتہ چل گیا کہ صحن میں کوئی اُترا ہے۔ وہیں سے اُس نے اپنے آدمیوں کو پکارا، اور خود دو نالی بندوق جو دیوار کے ساتھ لٹکی رہتی تھی، لے کر دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ ادھر سے اس کے آدمی کلہاڑیاں لے کر آ گئے۔ اُس رات اس کی ڈیوڑھی میں تین آدمی تھے۔

جو آدمی صحن میں اُترے تھے وہ بھاگنے لگے لیکن ابرار اور اس کے آدمیوں نے انہیں گھیر لیا۔ دو نالی بندوق دیکھ کر وہ ڈھیلے پڑ گئے۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا کہ پہلے اُس کی بات سن لی جائے پھر اُن کے ساتھ جو سلوک بھی کرنا ہے کر لیا جائے

ان تینوں کی تلاشی لی گئی۔ ایک کے پاس کلہاڑی تھی اور باقی دو کے پاس لمبے لمبے چاقو تھے۔ ابرار انہیں ڈیوڑھی میں لے گیا۔

"چوہدری ابرار!" ——— اُن تین میں سے ایک نے کہا ——— "ہماری تمہاری کوئی دشمنی نہیں۔ یہ ہمارا پیشہ ہے۔ ہم پیسے لے کر یہ واردات کرنے آئے تھے"

"کیا واردات کرنی تھی؟"

"سجاد ٹھیکیدار نے کہا تھا کہ اُس کی بیوی کو اُٹھا کر لانا ہے" ــــ ایک نے کہا ــــ "اور اگر وہ اُٹھائی نہ جا سکے تو اُسے قتل کر کے آنا ہے۔ ہم آدھی آدھی رقم وصول کر چکے ہیں۔ باقی رقم واردات کر کے لینی تھی۔"

ابرار نے اُن کے ہتھیار اپنے پاس رکھ لیے اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ ان کی اتنی پٹائی کرو کہ صبح تک بیہوش پڑے رہیں۔ ابرار خود باریک بید لے آیا۔ ڈیوڑھی کے دونوں دروازے بند کر کے ابرار کے آدمیوں نے ان تینوں کو گھونسوں اور لاتوں کی مار دی۔ پھر ابرار نے تینوں کو پیٹ کے بل لٹا کر انہیں بید جو مارنے شروع کیے تو تینوں کی چیخیں آسمان تک پہنچنے لگیں۔ خدیجہ بھی آ گئی تھی۔ ابرار نے اُسے بتایا کہ یہ اُسے اُٹھا لے جانے یا قتل کرنے آئے تھے۔ ابرار کے کہنے پر خدیجہ نے اپنی جوتی اتاری اور تینوں کے سروں پر برسانے لگی۔

جب یہ تینوں ادھ موئے ہو گئے تو ابرار نے انہیں باہر نکال دیا۔

"میں تم تینوں کی لاشیں غائب کرا سکتا ہوں" ــــ ابرار نے انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا ــــ "لیکن میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ تم اپنے جیسے لوگوں کو بتاؤ کہ آئندہ اُجرت لے کر واردات کرنے نہ جانا۔"

ان تینوں میں سے ایک کو ابرار اچھی طرح جانتا تھا بلکہ تھوڑی بہت سلام دُعا بھی تھی۔ ابرار نے مجھے اُس آدمی کا نام بتایا۔ اس آدمی کو میں بھی جانتا تھا۔ یہ میرے علاقے کا وارداتیا تھا اور میرا مخبر بھی۔ بڑا دلیر اور عقل والا آدمی تھا۔ اس واردات میں اُس نے عقل مندی کا یہ مظاہرہ کیا تھا کہ ابرار رات کو اپنا رکھوالی والا کتا کھول دیا کرتا تھا۔ یہ خونخوار کتا رات کو کسی اجنبی کو مکان کے قریب سے گزرنے بھی نہیں دیا کرتا تھا۔ اس آدمی نے جس کا نام شاردا تھا، اس کتے سے بچنے کا یہ انتظام کیا تھا کہ کسی مردار کی

ٹانگ کی ایک ہڈی میں پھیپھڑے بھر کر ساتھ لے گیا تھا۔ اُس نے ابرار کے مکان کے قریب جا کر دیکھا کہ کتا کہاں ہے۔ اُس نے منہ سے کوئی آواز نکالی۔ کتا غرّاتا ہوا آیا۔ شاردا نے ہڈی کتے کی طرف پھینک دی۔ کتا اس میں سے پھیپھڑے نکالنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ کبھی بھی ہڈی میں سے پھیپھڑے نہیں نکال سکتا تھا مگر نکالنے کی کوشش کرتا رہا اور شاردا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔

میں نے اُسی وقت ایک کانسٹیبل سے کہا کہ شاردا کو ڈھونڈنے اور تھانے لانے کا انتظام کرے۔ وہ بہت دنوں سے تھانے میں نہیں آیا تھا۔

"میرے گھر میں یہ پہلی واردات ہوئی ہے" ــــ ابرار حسین نے کہا ــــ "ایسے سمجھ لیں کہ کسی نے پہلی بار میرے گھر میں واردات کرنے کی جرأت کی ہے۔ میرے گھر کو چھوڑیں، میرے گاؤں میں کوئی نامی ڈکیت واردات کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ میرے گھر میں واردات کرانے والے کو میں ایسی نصیحت کرنا چاہتا تھا کہ وہ وصیت کر کے مرے کہ آئندہ ایسی جرأت نہ کرنا۔ میرے دل میں پہلا ارادہ یہ آیا کہ سجاد کو قتل کرا دوں گا۔ میں نے خدیجہ کو بتایا تو اُس نے مجھے روک دیا۔ کہنے لگی کہ تم پکڑے جاؤ گے۔ میں نے اُسے کہا کہ اس کے گھر ڈکیتی کی واردات کرا دوں گا۔ میں اس کے گھر کو آگ بھی لگوا سکتا تھا لیکن میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ قتل پر ہی آجاتا تھا مگر خدیجہ میری منت سماجت کرنے لگی کہ میں یہ ارادہ دل سے نکال دوں.....

"اسی سوچ میں چار پانچ دن گزر گئے۔ آج جب کانسٹیبل میرے پاس آیا تو پتہ چلا کہ سجاد کا بھائی قتل ہو گیا ہے۔ خدیجہ نے مجھے بتایا کہ وہ تو بہت ہی شریف آدمی تھا۔ میں نے خدیجہ سے کہا کہ سجاد کو میرے ہاتھوں قتل ہونا ہے لیکن آپ نے اسے حوالات میں بند کر دیا ہے۔"

میں نے ابرار حسین پر بہت جرح کی لیکن اُس نے میری تسلی کر دی۔

میں نے ابرار اور خدیجہ سے کہا کہ انہیں تھانے میں ہی ٹھہرنا پڑے گا

میرا شک پکّا ہو گیا

ایک تو میں نے شارد ا کو بلوا بھیجا تھا، اس سے پہلے میں نے ابرار کے گاؤں کے دو معزّز آدمیوں کو جو دراصل میرے معزّز مخبر تھے، تھانے بلوایا تھا۔ وہ آ گئے تھے۔ اس گاؤں کا نمبردار پہلے ہی تھانے میں تھا۔ وہ ابرار اور خدیجہ کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے ان تینوں سے باری باری ابرار حسین کے چال چلن وغیرہ کی رپورٹ لی۔ تینوں نے ایک جیسی رپورٹ دی۔ اس کے مطابق ابرار روپے پیسے والا زمیندار تھا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اتنی زیادہ زرخیز اراضی اور جائداد کا وہ اکیلا مالک تھا۔ اس کی ایک ہی بہن تھی جو ابرار سے بڑی تھی۔ اس حورت میں بڑے پن کا، اپنی اونچی ذات کا اور اتنی وسیع زمینداری کا ذرا سا بھی گھمنڈ نہیں تھا۔ ابرار اپنی اس بہن کو پیروں کی طرح مانتا تھا۔

ان تینوں نے مجھے بتایا کہ ابرار حسین کو کوئی بدمعاش کہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ اس کا یارانہ صرف بدمعاشوں کے ساتھ نہیں بلکہ بڑی بڑی وارداتیں کرنے والے عادی مجرموں کے ساتھ بھی تھا، لیکن گاؤں میں بلکہ اردگرد کے علاقے میں کوئی یہ نہیں کہے گا کہ ابرار حسین نے کوئی بدمعاشی کی ہے یا کسی کو پریشان کیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ابرار ہر کسی کے کام آنے والا آدمی تھا۔ گاؤں کی مسجد کے امام کو وہ ماہوار تنخواہ دیتا تھا اور کبھی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے کیا اور بڑے کیا، سب ابرار کی عزّت کرتے تھے اور اس سے ڈرتے بھی تھے۔

انہوں نے تصدیق کی کہ ابرار نے خوبصورت لڑکیوں کے بھی رشتے ٹھکرا دیئے تھے۔ صرف یہ ایسا مسئلہ تھا جس میں وہ اپنی بہن کی ایک نہیں سنتا تھا، باقی اسے بہن جو کہتی وہ مان لیتا تھا۔ دوستوں نے

بھی اسے کہا تھا کہ اب شادی کر لے لیکن اس نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو لڑکی اس کے دل کو پسند آئے گی، اس کے ساتھ شادی کرے گا۔

ان تینوں نے چند ایک واقعات بھی سنائے اور ثابت کیا کہ ابرار حسین اوچھا اور مغرور آدمی نہیں اور اگر یہ وار کرنے پر آ جائے تو خود گھر بیٹھا رہتا ہے اور اس کے دشمن کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے۔ اس سے مجھے شک ہونے لگا کہ سجّاد پر ابرار نے ہی جوابی وار کیا ہوگا۔ سجّاد کے گھر اس کے آدمی گئے۔ سجّاد شہر گیا ہوا تھا۔ اس کے گھر میں اس کا بھائی تھا۔ ابرار کے آدمیوں نے سوچا کہ کچھ کر کے واپس جائیں۔ چنانچہ وہ سجّاد کے بھائی کو ہی مار گئے۔

صرف ایک بات میرے شک کے خلاف تھی .... قاتل اگر کرائے کے تھے تو وہ پیشہ ور ہوں گے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ پیشہ ور مجرم ایک امیر آدمی کے گھر میں واردات کرنے جاتے اور خالی ہاتھ واپس آ جاتے۔ وہ سجّاد کا گھر خالی کر آتے۔ ایک اور بات ذہن میں رکھنے والی ہے۔ اگر ابرار نے جوابی وار کیا تھا تو خدیجہ کو ضرور معلوم ہوگا۔ خدیجہ کو اس کے بھائی اور ماں باپ نے بتایا تھا کہ سجّاد نے اس کا زیور واپس نہیں کیا تھا۔ خدیجہ ابرار سے ضرور کہتی کہ اپنے آدمیوں سے کہنا کہ اس کا زیور اور سجّاد کی پہلی بیویوں کے زیورات بھی فلاں جگہ پڑے ہیں وہ نکال کر لے آئیں۔

میں نے دماغ کو ذرا آرام دینے کے لیے تفتیش روک دی اور گھر چلا گیا۔ نہا کر کھانا کھایا اور سو گیا۔

میں تین گھنٹوں سے ذرا زیادہ ہی سویا ہوں گا۔ تھانے میں آیا تو پتہ چلا کہ شارد ا میرے جانے کے فوراً بعد آ گیا تھا۔ میں نے اسے بلایا اور دوستانہ بے تکلفی سے کہا کہ اتنے دنوں سے اس نے شکل ہی نہیں دکھائی۔

"بس ایسے ہی کام دھندے میں لگے رہے ملک صاحب"—— اس

نے کہا ـــــ "آپ کا اشارہ ملا اور دوڑے آئے ... سجاد ٹھیکیدار کو بند کر رکھا ہے؟ ..... اُس کا بھائی قتل ہو گیا ہے نا ... ٹھیکیدار کے خلاف کوئی شہادت مل گئی ہے؟"

"شہادت تو بہت مل گئی ہے شاردے!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "ثبوت تم لاؤ گے۔"

"میں؟"

"ہاں تم" ـــــ میں نے کہا ـــــ "لیکن تم تو اناڑی نکلے یار!"

"وہ کیسے حضور؟"

"چوہدری ابرار کے ساتھ سجاد ٹھیکیدار کی بیوی کو تھانے میں نہیں دیکھا؟" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم اسی کو اٹھانے یا قتل کرنے گئے تھے نا؟ ..... وہاں جا کر ان سے جوتے کھا آتے؟"

شاردا کو بدک جانا چاہیئے تھا لیکن اُس پر جیسے کچھ اثر ہی نہ ہوا ہو۔ "ملک صاحب!" ـــــ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "ہم غریب آپ کا دیا کھاتے ہیں۔ آپ کی جوتیوں کے غلام ہیں۔ آپ کو پتہ چل ہی گیا ہے تو میں انکار کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں ..... ایک بات بتا دیں حضور! معاملہ گڑبڑ تو نہیں؟ چوہدری ابرار نے تو کہا تھا کہ تھانے میں رپورٹ نہیں کرے گا۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں شاردے!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "ابرار نے اب بھی رپورٹ نہیں لکھوائی۔ میں نے تمہیں سجاد کے بھائی کے قتل کے سلسلے میں بلایا ہے۔ مجھے ابرار پر شک تھا کیونکہ سجاد کی بیوی اس کے پاس ہے۔ جب پتہ چلا کہ سجاد نے تمہیں دو آدمیوں کے ساتھ ابرار کے گھر سے خدیجہ کو اٹھا لانے یا قتل کر آنے کے لیے بھیجا تو ابرار پر میرا شک پکا ہو گیا۔"

"یہ شک دل سے نکال دیں" ـــــ شاردا نے کہا ـــــ "اپنے بھائی کو سجاد نے قتل کیا ہے؟"

"کوئی ثبوت؟"

"کوئی ثبوت نہیں" ـــــ شاردا نے جواب دیا ـــــ "ثبوت آپ پیدا کریں گے۔ آپ کو خدا نے بہت زیادہ عقل دی ہے۔ میں آپ کو کچھ بتا دیتا ہوں ..... سجاد کے مُنہ سے پہلی بات یہ نکلتی ہے ـــــ 'قتل کر دو۔ یہ لو رقم' ـــــ اپنی تیسری بیوی کو جو باہر ابرار کے پاس بیٹھی ہے، سجاد نے قتل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُسے کافی میں بیہوشی کی کوئی دوائی پلا دی۔ میرے ساتھ اُس نے پہلے ہی معاملہ طے کر رکھا تھا۔ میرا کام یہ تھا کہ ایک آدمی ساتھ لوں یا دو آدمی ساتھ لوں اور اس کی بیوی کو اٹھا کر ریل گاڑی کی پٹڑی پر لٹا آؤں۔ میں نے سجاد سے پانچ ہزار مانگا تھا۔ اس نے ساڑھے تین ہزار دیا تھا" ـــــ وہ چپ ہو گیا پھر بولا ـــــ "ملک حضور! میں اقبال جرم کر رہا ہوں۔ آپ کا کرم چاہیئے۔"

میں نے اُسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ میرے سامنے سجاد کے چھوٹے بھائی صادق کے قتل کا کیس ہے اور میں کسی ایسی واردات کی طرف توجہ نہیں دوں گا جس کی میرے پاس رپورٹ ہی نہیں آئی۔ میں نے شاردا کو بتایا کہ یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ سجاد نے اپنی بیوی کو بیہوشی کی دوائی پلا کر ریلوے لائن پر ڈال دیا تھا۔

قتل کا دلچسپ طریقہ

"تو سنیں" ـــــ شاردا نے بے فکر ہو کر بولنا شروع کر دیا ـــــ

"میں نے دو آدمی ساتھ لیے" ـــــ اُس نے دونوں آدمیوں کے نام لیے اور کہنے لگا ـــــ "ہم ٹھیکیدار کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ خود میرے پاس آیا۔ دونوں آدمی میرے ساتھ تھے۔ میں نے انہیں ایک ایک ہزار روپیہ دیا اور ڈیڑھ ہزار خود رکھا۔ ہم سجاد ٹھیکیدار کے

گھر گئے۔ میں نے اس کی بیوی کو جو پلنگ پر بیہوش پڑی تھی اس طرح اپنے کندھے پر ڈالا کہ اُس کا پیٹ میرے کندھے پر تھا۔ اُوپر کا دھڑ پیچھے کو اور نیچے کا دھڑ آگے کو لٹک رہا تھا۔ اس کے اُوپر چادر اس طرح ڈالی ہوئی تھی کہ کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ چادر کے نیچے عورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔

"رات کا وقت تھا۔ راستے میں ہمیں کوئی نہ ملا۔ ہم نے ٹھیکیدار کی بیوی کو باری باری اٹھایا اور آبادی سے دُور ریل کی پٹڑی پر اس طرح لٹا دیا کہ اس کی گردن پٹڑی پر رکھی اور سر باہر کو۔ ہم واپس آگئے۔ صبح ہوئی تو میں اُدھر گیا جہاں اس لڑکی کو لٹایا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہاں لوگوں کا ہجوم ہوگا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ قریب جاکر دیکھا خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ سجّاد نے کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو اس لیے بیہوش کرکے پٹڑی پر لٹائے گا کہ اس کا خون نکلے گا اور لوگ کہیں گے کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ مرے ہوئے آدمی کے اُوپر سے گاڑی گزر جائے تو خون نہیں نکلتا۔ پولیس اسے قتل کہہ کر تفتیش کرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

"میں نے سجّاد ٹھیکیدار کو جاکر بتایا کہ اُس کی بیوی غائب ہے اور اُس کے خون کا نشان تک نہیں۔ ٹھیکیدار سخت گھبرایا۔ کہنے لگا۔ مارے گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی روک لی ہوگی اور اُتر کر دیکھا ہوگا کہ کوئی عورت بیہوش پڑی ہے تو اُس نے اسے اٹھا کر انجن میں ڈال لیا یا گارڈ کے حوالے کر دیا ہوگا، پھر اسے پولیس کے حوالے کر گئے ہوں گے۔ ٹھیکیدار نے یہ مشہور کر دیا کہ اُس کی بیوی بدمعاش عورت تھی، کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"چار پانچ روز گزرے، سجاد ٹھیکیدار نے مجھے بلایا اور کہا کہ اُسے اپنی بیوی کا سراغ مل گیا ہے۔ اُس نے چوہدری ابرار حسین کا اور اس کے گاؤں کا نام لیا اور کہا کہ اُس کی بیوی کو وہاں سے اٹھا کر لانا ہے یا وہیں قتل کرانا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اب وہ بیوی کو کیا کرے گا؟ اس نے کہا کہ بیوی اُسے کسی بھی وقت قتل کرا سکتی ہے یا کوئی اور کارروائی کرا دے گی ۔ ۔ ۔

"میں نے اُسے کہا کہ اب میں چھ ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔ اس نے پانچ ہزار پر سودا کر لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملک صاحب! سجاد ٹھیکیدار نے مجھے عیش بہت کرائی ہے۔ مجھے کبھی کبھی وہ آتی شراب پلاتا تھا۔ دو مرتبہ مجھے شہر بڑے غضب کی ایک طوائف کے پاس لے گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے مجھے ابرار کا گھر سمجھا دیا۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ ابرار کے پاس رکھوالی کا کُتا بھی ہے۔ میں نے ہڈی میں چھیچھڑے ڈال کر کُتے کا بندوبست کر لیا۔ وہاں جاکر دیوار کے اُوپر سے اندر چلے گئے لیکن پکڑے گئے اور بہت بڑی مار کھا کر واپس آگئے ۔ ۔ ۔ ۔ چوہدری ابرار شہنشاہ ہے ملک صاحب! اُس نے ہمیں چھوڑ دیا۔ میرے ساتھ وہی دو آدمی تھے جو ٹھیکیدار کی بیوی کو پٹڑی پر رکھنے گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" واپس آکر ٹھیکیدار کو بتایا کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے اپنی رقم واپس مانگی۔ میں نے کہا کہ میں ایک پیسہ واپس نہیں کروں گا۔ اُس نے کہا کہ ساری رقم رکھو لیکن ابرار مجھ سے بدلہ لے گا۔ مجھے بچانا تمہارا کام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ٹھیکیدار جتنا بے ایمان ہے اتنا ہی ڈرپوک اور بیوقوف ہے۔ میں بھلا اسے ابرار سے کیسے بچا سکتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ ابرار تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے، میں اس کی آنکھیں نکال دوں گا۔ ٹھیکیدار خوش ہوگیا ۔ ۔ ۔ ۔

" اب اصل بات سُنیں ملک حضور! اس واقعہ کے دو روز بعد سجاد ٹھیکیدار نے مجھے بلایا اور کہنے لگا کہ چھوٹے بھائی سے میں تنگ آگیا ہوں۔ اسے غائب کر دو ۔ ۔ ۔ مجھے معلوم تھا کہ چھوٹا بھائی (مقتول) اس سے جائیداد کا حصّہ اور اُس نے اس کے ساتھ کاروبار میں جو پیسہ لگایا تھا وہ واپس مانگ رہا تھا اور سجّاد اس کا حصّہ اور پیسہ ہضم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سجّاد اپنے چھوٹے بھائی کی بیوی کے پیچھے بھی پڑا ہوا تھا۔ اس نے یہ بات جب مجھے بتائی تھی، اس وقت وہ نشے میں دھت تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ اس کام کا بھی سودا کر لیا۔

لیکن اُس نے کہا کہ کام کر دو گے تو پھر پیسے دوں گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ پہلا پانچ ہزار بھی تمہارے پاس ہے۔ تم وہ کام بھی پورا نہیں کر سکے تھے۔ میں نے اُس سے کہا — 'چلو سجاد بابو! جو دو گے لے لوں گا۔'

اُس نے کہا کہ کل رات وہ چھاؤنی چلا جائے گا اور کسی نہ کسی طرح اپنے چھوٹے بھائی کو گھر میں سُلا جائے گا۔ پھر میرا یہ کام ہو گا کہ رات کو اُس کے چھوٹے بھائی کو قتل کر دُوں گا۔ دوسرے دن سجاد آئے گا اور وہ شور مچا دے گا کہ اُس کی غیر حاضری میں کوئی اُس کے بھائی کو قتل کر گیا ....

"میں اُس شخص کی عقل پر حیران ہُوا کہ بھائی کو اپنے گھر میں قتل کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں اور بھی قتل کرایا جا سکتا ہے۔ اُس نے شاید یہی بہتر سمجھا ہو گا۔ دوسرے دن سجاد مجھے مِلا اور کہنے لگا کہ وہ چھاؤنی جا رہا ہے اور میں آج رات یہ کام کر دوں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو راضی کر لیا ہے کہ وہ اس کے گھر سو جائے گا۔ ملک صاحب! آپ شاید یقین نہ کریں میں گناہگار آدمی ہوں، میری قسموں پر بھی آپ اعتبار نہیں کریں گے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ سجاد نے جب مجھے کہا کہ اُس کا بھائی رات اُس کے گھر سوئے گا اور میں اپنا کام کر دوں تو مجھے اچانک خیال آیا کہ صادق (مقتول) تو بہت ہی نیک اور شریف آدمی ہے۔ میرے متعلق اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں غنڈہ اور بدمعاش ہوں اور اُس کے بھائی کا دوست ہوں، پھر بھی وہ جب میرے پاس سے گذرتا، مسکرا کر السلام علیکم کہتا تھا۔ حال احوال پوچھتا تھا۔ میرے دل سے آواز آئی، نہ شارو دے! یہ کام نہ کرنا ....

"ملک حضور! میں نے سجاد ٹھیکیدار سے کہا — 'نہ بھائی! یہ کام کسی اور سے کرا لو۔ میں نہیں کر سکوں گا۔ اب لگتا ہے کہ میرے اُلٹے دن آ گئے ہیں۔ تمہاری بیوی کو ریل کی پٹڑی پر ڈال آئے تو مرنے کی بجائے وہ غائب ہو گئی۔ اُسے ابرار کے گھر سے اُٹھا لانے کے لیے گئے تو ہڈیاں تڑوا کر اور جوتے کھا کر واپس آ گئے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے

کہ مجھ سے یہ کام بھی نہ ہو سکے گا'....

"سجاد ٹھیکیدار نے مجھے بہت لالچ دیئے، دوستی کے واسطے دیئے لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ میں نے اُسے صاف جواب دے دیا۔ اُس نے کہا — 'چلو تم میرا کام نہیں کرو گے تو میں خود کر لوں گا یا کسی اور سے کرا لوں گا' — میں نے اُسے کہا — 'اگر یہ کام خود کرنا ہے تو میں تمہیں طریقہ بتاتا ہوں۔ اب چھاؤنی چلے جاؤ۔ رات کو لاری آتی ہے۔ اُس میں آ جانا لیکن تمہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ بھائی سویا ہُوا ہو گا — تمہارے مکان کے باہر کے دروازے کی چٹخنی اور زنجیر باہر سے کھل جاتی ہے۔ اندر جا کر سوتے ہوئے بھائی کا گلا دبا دینا'....

"اُس نے کہا — 'نہ یار! میں گلا نہیں دبا سکوں گا۔ میرے پاس بڑا کمانی دار چاقو ہے۔ وہ استعمال کروں گا' — میں نے اُسے کہا کہ قتل کر کے گھر سے نکل جانا۔ اپنے کپڑے اچھی طرح دیکھ لینا۔ چاقو دھو ڈالنا اور شہر سے دُور چلے جانا۔ علی الصبح آنا اور یہ ظاہر کرنا کہ تم شہر سے پہلی لاری سے آتے ہو...... اُسے میری یہ ترکیب پسند آ گئی۔ وہ دن گزرا۔ رات بھی گزر گئی، اور اگلی صبح مجھے اطلاع ملی کہ سجاد ٹھیکیدار کا چھوٹا بھائی صادق سجاد کے گھر میں قتل ہو گیا ہے"۔

"تم نے مجھے یہ ساری باتیں پہلے کیوں نہیں بتائیں؟" — میں نے شارو سے پوچھا — "اس کا مطلب یہ ہُوا کہ مجھے تم پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے"۔

"آپ سمجھے نہیں حضور؟" — شارو نے کہا — "سجاد ٹھیکیدار کی دو وارداتوں میں میں خود شامل تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ آپ مجھے ہی اندر کر دیں گے۔ میں تو اب بھی جھوٹ بول سکتا تھا لیکن ملک حضور! آپ کے سامنے آ کر جھوٹ نہ بولا گیا۔ مجھ پر آپ کے بڑے احسان ہیں"۔

میں نے تو پہلے دن ہی اپنے دل میں یہ شک بٹھا لیا تھا کہ اپنے بھائی کو سجاد نے خود قتل کیا ہے۔ اس کے بعد مجھے کئی واقعاتی شہادتیں

ملیں۔ وہ سب سجّاد کو قاتل ثابت کرتی تھیں۔ اب شاردا نے میرے شک کو پختہ یقین میں بدل دیا۔ میں آپ کو تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ وہ واقعاتی شہادتیں کیا تھیں۔ میں نے شاردا سے اور بھی بہت سی باتیں پوچھیں، بعض کی تردید ہوئی اور زیادہ تر کی تصدیق ہو گئی۔

ابھی چند اور آدمی تھے جن سے میں نے پوچھ گچھ کرنی تھی۔ دو شاردا کے ساتھی تھے اور دو آدمی ابرار حسین کے تھے جو خدیجہ کو ریلوے لائن سے ساتھ لے کر ابرار کے حوالے کر آتے تھے۔

میں نے اے۔ایس۔آئی سے کہا کہ وہ ان چاروں آدمیوں کو تھانے حاضر کرے۔

میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

یہ بھی مانتا ہوں لیکن....

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا جب میں نے سجّاد کو حوالات سے نکلوایا اور اپنے دفتر میں بٹھا دیا۔ ایک تو اُس پر نیند کا غلبہ تھا دوسرے وہ نشے سے ٹوٹا ہُوا تھا۔ شراب پینے والے آدمی کو سگریٹ کا ایک کش بھی نہیں ملا تھا اور تیسرے یہ کہ وہ قتل کے الزام میں پکڑا ہُوا تھا اس لیے اس کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ اُس نے میرے دفتر میں آتے ہی شور شرابہ شروع کر دیا کہ میں نے کسی وجہ کے بغیر اُسے حوالات میں بند کر دیا ہے۔

"سجّاد بھائی!" —— میں نے اُس سے کہا —— "اقبالِ جرم کر لو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ اپنی صفائی میں کیسے کیسے گواہ لاؤ۔ میں تمہیں سزائے موت نہیں ہونے دوں گا، عمر قید بھی نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ نہ مانا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ یہی کہے جا رہا تھا —— "ادھر میرا بھائی قتل ہو گیا ہے ادھر آپ

نے مجھے حوالات میں بند کر دیا ہے۔"

"ٹھیکیدار صاحب!" —— میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور سر کو جھنجھوڑ کر کہا —— "کس کس گواہ کو جھوٹا ثابت کرو گے اور کون کون سی شہادت اور ثبوت کو جھٹلاؤ گے۔ مجھے تمہارے اقبالِ جرم کی ضرورت ہی نہیں۔ میری شہادت مکمل ہے۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون نہیں کرو گے تو میں کیس اتنا زیادہ مضبوط بناؤں گا کہ تمہیں سزائے موت ملے گی۔ میں اس صورت میں کہ تم میرے ساتھ تعاون نہیں کر رہے، حلفیہ کہتا ہوں کہ میں تمہیں پھانسی کے تختے پر کھڑا کر کے دم لوں گا۔"

"ملک صاحب!" —— اُس نے رازدارانہ لہجے میں کہا —— "جتنی رقم آپ کہیں گے میں پیش کروں گا۔ مجھے چھوڑ دیں۔ میں بے گناہ ہوں۔"

"کیا تم نے اپنی بیوی کو کافی میں بیہوشی کی دوائی ملا کر اُسے بیہوش نہیں کیا تھا؟" —— میں نے پوچھا —— "کیا تم نے شاردا سے سودا کر کے اپنی بیہوش بیوی کو ریلوے لائن پر نہیں پھینکا تھا؟"

سجّاد نے مجھے یوں چونک کر اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے کسی نے اُس کی پیٹھ میں خنجر اُتار دیا ہو۔

"کیا تم نے ابرار حسین کے گھر سے خدیجہ کو اغوا، یا قتل کرنے کے لیے شاردا اور اُس کے دو ساتھیوں کو نہیں بھیجا تھا؟"

اُس کا منہ کھُل گیا لیکن اس منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

"کیا تم نے شاردا سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ تمہارے بھائی کو قتل کر دے؟"

"نہیں" —— اُس نے اچھل کر کہا —— "خدا کی قسم، میں نے شاردا سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔"

اس کے بعد میں نے اُس کی کئی اور حرکتوں کو اُس کے سامنے رکھا۔

اب چونکہ اُس کی زبان چل پڑی تھی اس لیے وہ ہر بات سے انکار کرتا

رہا۔ اُسے انکار ہی کرنا چاہیے تھا۔ وہ بڑا ہی ڈھیٹ آدمی تھا۔

"تمہارے انکار سے سچ جھوٹ نہیں ہو سکتا" ــــ میں نے کہا ــــ "اور تمہاری قسمیں جھوٹ کو سچ میں نہیں بدل سکتیں ..... میں نے تمہیں کہا ہے کہ مجھے تمہارے اقبالِ جرم کی ضرورت نہیں لیکن تم ہر بات کو جھٹلاتے چلے جا رہے ہو جیسے میں یہاں بیٹھا گنڈیریاں بیچ رہا ہوں۔ میں تمہیں ابھی پچھلے کمرے میں بھیجتا ہوں۔ وہاں تمہاری ملاقات میرے دو کانسٹیبلوں کے ساتھ ہو گی۔ صبح تم آئینے میں اپنی صورت دیکھو گے تو اپنے آپ کو پہچان نہیں سکو گے۔"

"ملک صاحب!" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں یہ مان لیتا ہوں کہ میں نے اپنی بیوی کو دھوکے میں بیہوشی کی دوائی پلائی تھی اور اسے مروانے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ شارا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اسے ریلوے لائن پر لٹا آیا تھا ..... میں یہ بھی مانتا ہوں کہ میں نے اپنی بیوی کو اغوا، یا قتل کرانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اپنے بھائی کو قتل نہیں کیا۔ میں اُس رات یہاں تھا ہی نہیں۔"

"تم یہیں تھے" ــــ میں نے کہا۔

میں نے جب دیکھا کہ وہ اقبالِ جرم پر آمادہ نہیں ہو رہا تو میں نے سوچا کہ اس کے اقبالِ جرم کے بغیر ہی شہادت مکمل کر لی جائے۔ اگر میں شہادت کی تفصیل سنانے لگوں اور یہ بھی کہ کس گواہ نے کیا کہا اور میں نے کیسے کیسے ثبوت پیش کیے تو یہ بہت ہی لمبی روئیداد ہو جائے گی۔ میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ مجھے یقین تھا کہ اپنے بھائی کو سجاد نے ہی قتل کیا ہے۔ ہر کوئی یہی کہتا تھا۔ موقعہ کا گواہ ایک بھی نہیں تھا۔ مجھے اس کمی کو بھی پورا کرنا تھا۔ میں نے چونتیس گواہ پیش کیے تھے۔ سجاد کی صفائی بہت کمزور تھی۔ اُس نے بڑا قابل اور تجربہ کار وکیل کیا تھا۔ وہ زیادہ تر اس نکتے پر بولتا رہا کہ سارا کیس واقعاتی شہادتوں پر بنایا گیا ہے لیکن میری واقعاتی شہادتیں اتنی مضبوط تھیں جسے ملزم کا وکیل جھٹلا نہ سکا۔ سرکاری

وکیل نے بہت محنت کر کے سیشن کورٹ کو قائل کر لیا تھا کہ ملزم سجاد اپنے بھائی کا قاتل ہے۔

سیشن کورٹ نے سجاد کو سزائے موت سنا دی لیکن ہائی کورٹ نے اپیل میں سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا۔

ایک قانون اور بھی ہے

جب کوئی کیس کامیابی سے ختم ہو جاتا ہے یعنی ملزم کو سزا ہو جاتی ہے تو متعلقہ تھانیدار بہت خوش ہوتا ہے۔ مجھے بھی سجاد کو سزا دلا کر خوشی ہوئی۔ میری محنت اور دماغ سوزی ٹھکانے لگی تھی۔ یہ کیس میرے ذہن سے اُتر گیا۔ البتہ میری ذاتی ڈائری میں محفوظ رہا۔ پھر زمانے میں انقلاب آئے۔ جنگِ عظیم آدھی دنیا میں تباہی پھیلا کر ختم ہو گئی۔ دو اڑھائی سال اور گذرے تو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ میں بھی پاکستان آ گیا، اور چند مزید سال گذر گئے۔ میری تھانیداری بھی ختم ہو چکی تھی اور میں سیر سپاٹے کرتا پھر رہا تھا۔ اتنی لمبی اور اتنی تکلیف دہ سروس نے میرے اعصاب کو توڑ دیا تھا۔

سیر سپاٹے کے سلسلے میں لاہور چلا گیا۔ ان دنوں چھاؤنی کے سٹیڈیم میں ہارس اینڈ کیٹل شو ہو رہا تھا۔ میں ایک روز وہاں چلا گیا۔ گھوڑوں کا دَور ختم ہو چکا تھا۔ ان کی جگہ کاریں اور سکوٹر آ گئے تھے۔ مجھے گھوڑوں کے ساتھ دلچسپی رہی ہے۔

میں لاہور کے میلے میں گھوڑے دیکھ رہا تھا۔ اچانک کسی نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں سمجھا سروس کا کوئی پرانا ساتھی ہو گا۔ وہ مجھے گلے ملا پھر جھک کر میرے گھٹنے چھوتے۔ جب وہ سیدھا ہوا اور مصافحہ کیا تو میں اس شخص کو پہچان نہ سکا۔ اُس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ میں نے عمر کا اندازہ اپنے تجربے سے کیا تھا، ویسے وہ اتنا تندرست

اور اتنا خوبرو تھا کہ عمر سے بہت کم لگتا تھا۔

"پہچانا نہیں ملک صاحب؟" ـــــ اُس نے پوچھا۔

"کبھی ملاقات ہوئی ہوگی" ـــــ میں نے کہا ـــــ یاد نہیں آرہا۔"

"ابرار حسین میرا نام ہے" ـــــ اُس نے اپنے گاؤں کا نام بھی بتایا جو سرحد کے اُس طرف رہ گیا تھا ـــــ "آپ کو خدیجہ نامی عورت بھی یاد نہیں رہی؟ .... سترہ اٹھارہ سال گذر گئے ہیں ... سجاد ٹھیکیدار کو یاد کریں۔ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو قتل کیا تھا۔"

اچانک ایسے ہُوا جیسے اندھیرا ہوگیا ہو اور ایک فلم چل پڑی ہو۔ مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ ابرار حسین کا سترہ اٹھارہ سال پہلے کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں ابھی سروس میں ہوں یا ریٹائر ہوچکا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں ریٹائر ہوچکا ہوں اور یہ میلہ دیکھنے آیا ہوں۔

"پھر آپ میرے مہمان ہیں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میری دو گھوڑیاں نمائش میں آئی ہوئی ہیں۔ میں ہوٹل میں ٹھہرا ہُوا ہُوں۔"

دوپہر کے کھانے کے لیے وہ مجھے ہوٹل میں لے گیا۔ کھانے کے بعد اُس کے کمرے میں جا بیٹھے۔ کھانے کے دوران اُس نے مجھے بتایا کہ اُس نے خدیجہ سے شادی کرلی ہے۔

"خدیجہ زندہ اور سلامت ہے" ـــــ کمرے میں جا کر اُس نے بتایا ـــــ "تین بچے ہیں۔ بڑی لڑکی ہے اور چھوٹے لڑکے ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں ہوگا۔ سجاد نے سزا کے ابھی دو سال بھی پورے نہیں کیے تھے کہ جیل میں مرگیا۔ میں نے سُنا تھا کہ اُس کی موت کی اطلاع پر اُس کی لاش لینے کوئی نہیں گیا تھا۔ اُس کے باپ نے بھی کہہ دیا تھا کہ میرے بیٹے کو قتل کرنے والا میرا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ میں اُس کی لاش نہیں لاؤں گا۔"

"جیل والوں نے لاوارث قرار دے کر اُسے دفن کردیا ہوگا ـــــ"

میں نے کہا۔

"ملک صاحب!" ـــــ ابرار نے ایسی مسکراہٹ سے کہا جس میں مسکراہٹ والی کوئی بات نہیں تھی ـــــ "اب آپ تھانیدار تو نہیں۔ اُدھر کے کیس اُدھر ہی رہ گئے ہیں نا!"

"کیوں؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "یہ کیوں پوچھا ہے تم نے؟"

"اس لیے پوچھا ہے کہ اب میری گرفتاری کا خطرہ تو نہیں؟"

"نہیں یار نہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم بات کرو۔ اُدھر کی وارداتیں اُدھر ہی رہ گئی ہیں۔"

"اپنے چھوٹے بھائی کو سجاد نے قتل نہیں کیا تھا" ـــــ ابرار حسین نے کہا ـــــ "چھوٹا بھائی دھوکے میں مارا گیا تھا.... میرا خیال ہے کہ آپ کو سارا واقعہ سُنا دوں۔ آپ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی..... آپ کو یاد ہوگا کہ سجاد نے میرے گھر سے خدیجہ کو اغواء یا قتل کرنے کے لیے تین آدمی بھیجے تھے۔ میرے آدمیوں نے تینوں کو پکڑ لیا اور مار مار کر انہیں ادھ مؤا کردیا تھا۔ ان میں سے ایک کو میں جانتا تھا۔ اس کا نام شاردا تھا۔ میں نے اُسے دوسرے دن بلایا تو وہ فوراً پہنچا....

"مجھے معلوم تھا کہ وہ اُجرت پر جُرم کرنے والا آدمی ہے۔ میں نے اُس سے پُوچھا کہ سجاد نے اُسے اس واردات کے کتنے پیسے دیئے تھے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اس سے دُگنی رقم دُوں گا، سجاد کو ختم کردو۔ خدیجہ کے ساتھ پہلے بات ہوچکی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ سجاد کو وہ اپنے ہاتھوں قتل کرنا چاہتی ہے.... شاردا کو میری حیثیت کا علم تھا۔ وہ مجھ سے مُنہ مانگے پیسے لے سکتا تھا۔ ایسے کئی شاردے میری مُٹھی میں تھے۔ شاردا نے خوش ہوکر کہا کہ وہ میرا کام کردے گا....

"ہم دونوں سوچنے بیٹھ گئے کہ سجاد کو کس طرح قتل کیا جائے۔ شاردا اس کام کا ماہر تھا۔ اُس نے کہا کہ رات کو اُسے اُس کے گھر میں

مارے گا جب وہ سویا ہوگا۔ نثار دا نے بتایا کہ سجّاد کے گھر کا باہر کا دروازہ باہر سے کھل سکتا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ سجّاد کو گھر میں قتل کرنا ہے تو اُس گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔ ایک پیسے کی بھی چوری نہ ہو۔ میرا مطلب یہ تھا کہ نثار دا نے سجّاد کو قتل کر کے اُس کے ٹرنکوں سے زیور وغیرہ اُڑا لیا تو شک خدیجہ پر ہوگا کہ اس واردات میں اُس کا ہاتھ ہے۔ میں نے ہر طرح کی احتیاط برتی تھی .....

"دو تین رات بعد ایک رات نثار دا نے میرے دروازے پر دستک دی۔ میرے ایک آدمی نے مجھے جگا کر بتایا کہ نثار دا آیا ہے۔ میں اُسے اندر لے آیا۔ اُس کا خون آلود چاقو اُس سے لے لیا۔ اُس کے کپڑوں پر خون کے چند ایک چھینٹے تھے۔ اُسے اپنے کپڑے پہنائے۔ پھر اُس کے کپڑے اور چاقو رات ہی رات اُبلتے پانی میں ڈال کر خون صاف کر دیا۔

"نثار دا صبح اپنے کپڑے پہن کر شہر چلا گیا اور فوراً ہی واپس آ گیا۔ کہنے لگا کہ سجّاد تھانے گیا ہوا ہے۔ اُس کا چھوٹا بھائی مارا گیا ہے۔ نثار دا نے مجھے بتایا کہ اُس نے سجّاد کے باہر کے دروازے کو ذرا باہر کو کھینچا تو اوپر کی چٹخنی گر پڑی۔ پھر اُس نے چاقو کو دونوں کواڑوں کے درمیان سے اندر کیا۔ اور زنجیر اُتار دی۔ وہ سجّاد کا دوست تھا۔ اس گھر میں آتا رہتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ سجّاد کون سے کمرے میں سویا کرتا ہے۔ نثار دا اندھیرے میں بھی اُس کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں چھوٹا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی بہت مدھم تھی۔ سجّاد کا پلنگ کچھ دور تھا۔ وہ چادر اوپر لیے سویا ہوا تھا۔ چہرے پر اندھیرا تھا۔ نثار دا کو وہاں سے جلدی نکلنا تھا۔ اُس نے سوتے ہوئے آدمی کے سینے پر دل کی جگہ چاقو تین بار مارا اور وہاں سے نکل آیا ....

"بعد میں پتہ چلا کہ اُس رات سجّاد کا چھوٹا بھائی وہاں سویا ہوا تھا۔ سجّاد شہر گیا ہوا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ غلط آدمی قتل ہو گیا ہے تو میں نے نثار دا سے کہا کہ سجّاد کو ہی اپنے بھائی کے قتل میں پکڑوانا ہے۔ یہ تو

صرف اتفاق کی بات ہے کہ سجّاد یہ ثابت نہیں کر سکا کہ وہ رات شہر میں تھا۔ باقی حالات بھی اُس کے خلاف جاتے تھے۔ میں نے نثار دا کو الگ اُجرت پیش کی اور اُسے کہا کہ تھانیدار سے کہنا کہ سجّاد نے اسے کہا تھا کہ اُس کے چھوٹے بھائی کو قتل کرنا ہے۔ اس سلسلے میں نثار دا نے آپ کو جو بیان دیا تھا وہ بالکل جھوٹ تھا۔"

"کیا یہ بھی جھوٹ تھا کہ سجّاد نے خدیجہ کو بیہوش کر کے ...؟"

"یہ واقعہ صحیح تھا" ___ ابرار نے میری بات کاٹ کر کہا ___ "خدیجہ کو بیہوش کر کے ریلوے لائن پر پھینکنے والی ساری بات آپ کو نثار دا نے بالکل صحیح بتائی تھی۔ یہ بھی صحیح تھا کہ سجّاد نے اپنی دوسری بیوی کو زہر دیا تھا۔ اس میں نثار دا کا ہاتھ تھا۔ زہر بڑا ہلکا تھا جو دو دن کے وقفے سے دیا گیا تھا .... میں نے آپ کو جو بیان دیا تھا، اس کا وہ حصّہ بالکل جھوٹ تھا جو خدیجہ کے اغوا، یا قتل کی کوشش کے بعد کا تھا۔ میں نے دو آدمی پیش کیے تھے یعنی جو خدیجہ کو ریلوے لائن سے اُٹھا کر میرے پاس لاتے تھے۔ انہوں نے آپ کو سجّاد کے متعلق کچھ بتایا تھا۔ وہ سب کچھ جھوٹ تھا۔ نثار دا کے دو ساتھیوں کے بھی آپ نے بیان لیے تھے اور انہیں گواہ بنایا تھا۔ انہوں نے بھی آدھا سچ اور آدھا جھوٹ بولا تھا۔"

"تم نے مجھ سے بہت بڑا گناہ کروایا ہے ابرار!" ___ میں نے کہا ___ "میں جھوٹ کو سچ سمجھتا رہا۔"

"لیکن ملک صاحب!" ___ ابرار نے کہا ___ "سجّاد بے گناہ تو نہیں تھا۔ اُس نے ایک بیوی کو زہر دیا اور ایک بیوی کو بے ہوشی کی دوائی پلا کر کٹ مرنے کے لیے ریلوے لائن پر لٹا دیا تھا۔ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کی بیوی پر دست درازی کی .... اُسے خدا نے سزا دی ہے۔ آپ کا قانون اُسے نہیں پکڑ سکتا تھا۔ ایک قانون اور بھی ہے ..... خدا کا قانون .... اُسے سزا ملنی چاہیے تھی۔"

ابرار نے یہ بھی بتایا کہ سجّاد کو جب عمر قید ہو گئی تو ابرار کو کسی نے بتلایا

کر کسی آدمی کو سات سال یا اس سے زیادہ سزائے قید ہو جائے تو ایک

قانون ہے جس کے تحت اُس کی بیوی کورٹ میں درخواست دے کر دوسری شادی کر سکتی ہے۔ سجاد کی اپیل میں اُسے عمر قید ہو گئی تو ابرار نے خدیجہ کی طرف سے درخواست دے کر اُس کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ لے لیا اور شادی کر لی تھی۔

سجاد کا جب مقدمہ شروع ہوا تھا اُس وقت ابرار نے خدیجہ کو اُس کے ماں باپ کے گھر بھیج دیا تھا۔ پھر وہ باقاعدہ بارات لے کر گیا، اور خدیجہ کو بیاہ لایا تھا۔



رات کا راز

یہ کہانی سنانے سے پہلے میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ تفتیش اور سراغرسانی کی ہر کہانی دراصل پوری کتاب کی کہانی ہوتی ہے۔ پرچے میں اختصار سے کام لینا پڑتا ہے، اس لیے بعض اوقات ایسا لگتا ہے جیسے کہانی سنانے والا کہانی کو خود ایک خاص طرف یا کسی خاص آدمی یا عورت پر لے جا رہا ہے۔ تفتیشی کہانی میں چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات بھی ہوں تو پڑھنے والا کہانی کی سچائی پر شک نہیں کرتا۔ مثلاً میں پوری رات ایک مشتبہ سے تفتیش کرتا رہا ہوں مگر کہانی میں یہ تاثر آتا ہے کہ میں نے پانچ سات منٹ تفتیش کی تھی اور یہی کوئی چھ سات سوال پوچھے ہوں گے اور انہی سے مجھے اس شخص پر شک پکا ہو گیا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مشتبہ سے جواب کم لیے جاتے ہیں اور چہرے پر آنے والی تبدیلیاں زیادہ دیکھی جاتی ہیں۔ اُس کا جواب کچھ اور ہوتا ہے لیکن بولنے کا انداز اور چہرہ کچھ اور کہتے ہیں۔ جب تک اس کی پوری تفصیل نہ لکھی جائے کہانی کی سچائی پر شک باقی رہتا ہے۔

میں نے یہ وضاحت اُن پڑھنے والوں کے لیے کی ہے جو میری، محبوب عالم کی اور دوسرے حضرات کی کہانیوں پر شک کرتے ہیں کہ یہ کہانیاں بالکل سچی نہیں ہو سکتیں۔ ایسا شک نہ کریں۔ میں نے آپ کو مجبوری بتا دی ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی توقع نہیں رکھ سکتا کہ "حکایت" کے پورے شمارے میں صرف تفتیش کی کہانی آئے۔

اپنی تفتیش کی ایک اور کہانی سناتا ہوں ۔ اس میں بھی اختصار کو ضروری سمجھا گیا تو شاید قارئین کو شک پیدا ہو۔ ہونا نہیں چاہیئے ۔ یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔ آدھی رات کے وقت مجھے گھر سے اٹھایا گیا۔ رپورٹ آئی تھی کہ ایک کھلیان جل گیا ہے اور ایک جوان آدمی کو لائے ہیں جسے لاٹھیوں کی ضربیں لگی ہیں اور وہ بے ہوشی کی حالت میں ہے۔

میں تفتیش کے متعلق پریشان نہ ہوا کیونکہ یہ خاندانی دشمنی کی واردات تھی۔ شہروں میں رہنے والوں کے لیے کھلیان جلنے والا معاملہ شاید کوئی عجیب واقعہ ہو۔ میں ذرا اس کی وضاحت کر دیتا ہوں۔ گندم کی فصل پک جاتی ہے تو یہ کاٹ کر ڈھیر کی صورت میں خشک ہونے کے لیے رکھ دی جاتی ہے ۔ یہ ڈھیر ایسی شکل کے ہوتے ہیں کہ دور سے یہ گول جھونپڑے لگتے ہیں۔ یہ ایک دراز قد آدمی کے قد سے دو اڑھائی فٹ زیادہ اونچے ہوتے ہیں اور اوپر سے مخروطی ہوتے ہیں یا مقبرے کے گنبد کی طرح ۔ یہ دھوپ میں خشک ہوتے رہتے ہیں۔ خشک ہو چکنے کے بعد انہیں کھلیان میں پھیلا کر ان سے دانے اور بھوسہ الگ کیا جاتا ہے۔

دیہات میں اب بھی خاندانی دشمنیاں چلتی ہیں اور لڑائی اور قتل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ میں جس وقت کی بات سنا رہا ہوں اُس وقت بڑی ذاتوں کے لوگ آپس کی دشمنیوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ یوں ہوتا تھا کہ ایک خاندان کا ایک آدمی قتل ہو گیا۔ قاتل پکڑا گیا لیکن شک کی بناء پر بری ہو گیا۔ ایسا آدمی گاؤں میں آتے ہی قتل ہو جاتا یا ایک دو روز بعد دن دہاڑے مارا جاتا تھا اور قاتل نعرے لگاتے تھے کہ ہم نے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔ ایسے قاتل خود ہی تھانے میں آ جاتے یا گاؤں میں پولیس جا کر انہیں گرفتار کر لیتی تھی۔ تفتیش اور سراغرسانی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

دشمن خاندان ایک دوسرے کو دو اور طریقوں سے بھی نقصان پہنچایا

کرتے تھے۔ ایک یہ کہ ایک دوسرے کے مویشی مثلاً اچھی نسل کا ایک بیل یا بھینس یا گائے چوری کرا دیتے تھے۔ دوسرا طریقہ قتل جیسا ہی ظالمانہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کے کھلیان جلا دیتے تھے۔ ذرا سوچیں کہ سارے سال کی کمائی یہ فصل ہوتی تھی جو روپے پیسے کی بنیاد تھی۔ یہ جب پک گئی تو کسی دشمن نے آگ لگا دی۔ دشمنیوں کا یہ سلسلہ آج بھی چلتا ہے۔ اس میں تھوڑی سی کمی آ گئی ہے۔

مجھے جب اطلاع ملی کہ کھلیان کو آگ لگی ہے اور ایک آدمی کو لاٹھیوں کی ضربیں لگی ہیں تو میں اس لیے بھی پریشان نہ ہوا کہ یہ دشمنی کے سلسلے کی واردات ہے۔ یہ لوگ بتا دیں گے کہ ان کا دشمن کون ہے اور میں انہیں فوراً گرفتار کر لوں گا۔

اُس زمانے میں زخمی کو ہسپتال لے جانے سے پہلے تھانے لے جایا جاتا تھا۔ پولیس ضربوں اور زخموں کی تفصیل لکھتی تھی۔ اگر مضروب کی حالت مرنے والی ہوتی تو اُس کا نزعی بیان لکھا جاتا تھا۔ ایسے بھی ہوتا تھا کہ زخمی فوری طور پر مرہم پٹی نہ ہونے اور خون بہہ جانے سے تھانے میں ہی مر جایا کرتا تھا۔ کوئی مرے یا زندہ رہے، پولیس کا مسئلہ صرف یہ ہوتا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ بیان دے دے۔

ایسی ہی جلدی مجھے بھی تھی۔ میں نے تھانے میں جا کر سب سے پہلے مضروب کو دیکھا۔ اُسے چارپائی پر ڈال کر لائے تھے۔ وہ بیہوش تھا۔ سر سے تھوڑا سا خون نکلا تھا اور وہاں اُبھار تھا۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ وہاں لاٹھی لگی تھی۔ جلد ذرا سی پھٹ گئی تھی۔ سر پر ایسی ہی دو ضربیں تھیں ۔ قمیض ہٹا کر جسم دیکھا۔ پسلیوں کے نیچے لاٹھی لگنے کا بڑا صاف نشان تھا۔ یہ ضرب اُس وقت لگائی گئی ہو گی جب مضروب گر پڑا ہو گا۔ اس ضرب نے مجھے کچھ پریشان کیا۔ جگر، پتا یا تلی کے پھٹ جانے کا خطرہ تھا۔

وہ تو نوجوان لڑکا تھا۔ شکل وصورت کا بھی اچھا تھا۔ خوشحال

زمیندار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ خاندانی دشمنیاں اسی کلاس کے خاندانوں میں ہوا کرتی تھیں۔ مقدموں پر یہ لوگ دل کھول کر روپیہ اڑایا کرتے تھے۔

میں نے ضربیں لکھ لیں اور جو کاغذات تیار کرنے تھے وہ کئے۔ اس دوران مضروب کو ہسپتال بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل میرے اس پیغام کے ساتھ گیا کہ مضروب کے بچنے کا امکان نہ ہو تو نزعی بیان لینے کی کوشش کریں۔

اس کے ساتھ جو آدمی آئے تھے، اُن میں اُس کا ایک بڑا بھائی بھی تھا جسے میں اس لئے اچھی طرح جانتا تھا کہ چار پانچ مہینے پہلے وہ ڈکیتی کی ایک واردات میں میرا گواہ تھا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے جس میں کہانی والی کوئی بات نہیں۔ اس گاؤں کے باہر کی طرف ایک گھر تھا۔ ایک رات اس گھر میں تین آدمی دیوار پھاند کر داخل ہوئے اور گھر والوں کو جگا کر انہیں کلہاڑیوں سے ڈرایا اور دو ٹرنک اُٹھا کر نکل گئے۔

ان کے نکلتے ہی گھر والوں نے شور مچایا۔ گاؤں کے لوگ جاگ کر پہنچے۔ گھر والوں نے بتایا کہ تین آدمی ڈاکہ ڈال گئے ہیں۔ ڈکیتوں کے پیچھے جو آدمی گئے ان میں ایک یہ بھی تھا۔ اس کا نام مہتاب دین تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ دُور تک سب دوڑتے گئے اور رُک گئے۔ مہتاب لاٹھی اٹھائے دوڑتا گیا۔ ڈکیت آسانی سے بھاگنے کے لیے ایک ٹرنک پھینک گئے۔

مہتاب ایک ڈکیت تک پہنچ گیا۔ دو آگے نکل گئے تھے۔ مہتاب نے اُسے کندھے پر لاٹھی ماری۔ ڈکیت کے پاس کلہاڑی تھی۔

اُس نے مہتاب کو للکار کر کہا کہ وہ واپس چلا جائے ورنہ کٹ جائے گا۔ چاندنی رات تھی۔ مہتاب نے اُس کا چہرہ بھی پہچان لیا اور اُس کی آواز بھی۔ مہتاب ڈرنے والا آدمی نہیں تھا لیکن دو ڈکیت جو آگے نکل گئے تھے وہ بھی واپس آ گئے۔ مہتاب وہاں سے کھسک آیا۔ وہ لاٹھی

سے تین کلہاڑیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

اُس نے جس آدمی کو پہچان لیا تھا وہ اسی علاقے کے ایک گاؤں کا جرائم پیشہ تھا۔ رپورٹ جب تھانے آئی تو مہتاب نے مجھے اس آدمی کا نام اور گاؤں بھی بتایا۔ دوسرے دو کو وہ نہیں جانتا تھا۔ اس ڈکیت کو تو میں بھی جانتا تھا۔ وہ ایک بار کا سزا یافتہ تھا اور تھانے کے ریکارڈ پر تھا۔

میں نے اس آدمی کو پکڑا پھر اس کے ساتھیوں کو بھی پکڑ لیا۔ میرے علاقے کا ایک اور ڈکیت تھا۔ اُس نے مہتاب کو پیغام بھیجا کہ وہ گواہی نہ دے اور اگر پولیس کے ڈر سے گواہی دینے عدالت میں جائے تو یہ کہے کہ اُس نے کسی کو نہیں پہچانا تھا۔ تھانیدار اُس سے زبردستی بیان دلوا رہا تھا۔ مہتاب نے اُسے پیغام بھیجا تھا کہ وہ ضرور بیان دے گا، کیونکہ یہ اُس کے گاؤں کا معاملہ ہے۔ اس ڈکیت نے اُسے دھمکی دی تھی کہ عدالت میں بیان دے کر وہ پچھتائے گا۔ مہتاب میرا واحد گواہ تھا جس نے ایک ڈکیت کو پہچانا تھا۔ یہ میرا سب سے زیادہ کارآمد گواہ تھا۔ اُس نے گواہی دی تھی اور دو ملزموں کو چار چار سال اور اُن کے سزا یافتہ ساتھی کو چھ سال سزائے قید ملی تھی۔ چار مہینے پہلے ان کے مقدمے کا فیصلہ ہوا تھا۔

اُس نے مجھے مایوس کر دیا

اب مہتاب اپنے چھوٹے بھائی کو بے ہوشی کی حالت میں تھانے لایا۔ اُن دنوں فصل کٹ کر کھلیانوں میں پڑے تھے۔ مہتاب نے مجھے بتایا کہ رکھوالی کے لیے وہ خود کھلیان میں سویا کرتا تھا۔ یہ لوگ نوکروں پر بھی بھروسہ نہیں کیا کرتے تھے۔ گذشتہ رات اُسے ہلکا سا بخار ہو گیا تھا اس لیے اُس کے بھائی نے اُسے کھلیان میں نہ جانے دیا اور خود کھلیان میں جا کر سو گیا۔

آدھی رات کو گاؤں میں کسی نے شور مچایا —— "کسی کا کھلیان جل رہا ہے . . . . جاگو اوتے . . . . کھلیان جل گیا۔"

فصل تو سب کے کٹ کر کھیتوں کھلیانوں میں پڑے ہوتے تھے۔ بچوں اور بوڑھوں کو چھوڑ کر گاؤں کا ہر فرد کھیتوں کی طرف دوڑ پڑا۔ ساتھ والے کھلیانوں میں جو آدمی رکھوالی کے لیے سوتے ہوتے تھے وہ پہلے ہی پہنچ گئے تھے اور لاٹھیاں مار مار کر اور مٹی پھینک پھینک کر آگ بجھا رہے تھے۔ پانی نہیں ڈالا جا سکتا تھا کیونکہ آگ سے بچا ہوا فصل بھیگ جائے تو دانے پھول جاتے ہیں اور کسی کام کے نہیں رہتے۔

وہاں جا کر دیکھا کہ مہتاب کے فصل کے ایک ڈھیر کو آگ لگی تھی۔ اس کا بہت تھوڑا سا حصہ بچایا جا سکا۔ تین ڈھیر اور تھے، وہ محفوظ تھے۔ جس ڈھیر کو آگ لگی تھی اس سے دس بارہ قدم دور مہتاب کا چھوٹا بھائی زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ صرف آگ ہی پولیس کا کیس تھا مگر وہاں مہتاب کا بھائی بھی مضروب ہوا تھا۔ اُسے یہ لوگ چارپائی پر ڈال کر تھانے لے آئے۔

میں مہتاب اور اس کے باپ سے واردات کی تفصیل سن کر کچھ پوچھنے ہی لگا تھا کہ ہسپتال سے اطلاع آئی کہ جلدی آئیں۔ مضروب بیان دینے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں بڑی تیزی سے ہسپتال گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ مضروب مر گیا ہے۔ ڈاکٹر نے اُسے جو دوائیاں پلائی تھیں، شاید ان کا اثر تھا کہ مضروب ذرا ہوش میں آ گیا تھا لیکن یہ اُس کی زندگی کے آخری دو تین منٹ کی بیداری تھی۔ اس کے بعد وہ مضروب سے مقتول ہو گیا۔

"میں نے اُس سے بیان لیا ہے" —— ڈاکٹر نے بتایا —— "اس کا مطلب نکالنا آپ کا کام ہے۔ بیان صاف نہیں۔ وہ اچھی طرح بول نہیں سکتا تھا۔"

ڈاکٹر نے جو بیان تحریر کیا تھا اُس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔ "آنکھ کھلی۔ ایک ڈھیر کو آگ لگی ہوئی تھی۔ ابھی آگ شروع ہوئی تھی۔ ایک آدمی پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میں چارپائی سے کود کر اُس تک گیا۔

میرے دھکے سے وہ پیٹھ کی طرف سے آگ میں گرا۔ وہ اٹھا۔ اُس نے شور کیا کہ اسے سنبھالو، مجھے مار دیا۔ میں مڑا۔ دو آدمیوں نے لاٹھیاں ماریں، پھر . . . ."

ڈاکٹر نے اُس سے پوچھا کہ وہ کسی کو پہچانتا ہے؟ مقتول نے سر ہلایا کہ نہیں۔ پھر ڈاکٹر نے پوچھا کہ جس آدمی کو اُس نے آگ میں دھکا دیا تھا وہ جلا تھا . . . . مقتول جواب نہ دے سکا۔ وہ مر گیا۔

"میں نے اُس کے یہ الفاظ ذرا مشکل سے سمجھے تھے" —— ڈاکٹر نے مجھے بتایا —— "اُس کے منہ کے ساتھ کان لگا کر سنے تھے"۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ مقتول کے پاس کلہاڑی ضرور ہو گی لیکن اُس نے اپنے فصل کو آگ لگی دیکھی تو اُسے ہوش نہ رہا کہ کلہاڑی اُٹھاتا۔ وہ خالی ہاتھ اُس پر جا پڑا۔ وہ تین آدمی ہوں گے۔ دو نے اسے لاٹھیاں ماریں اور بھاگ گئے ورنہ وہ باقی ڈھیروں کو بھی آگ لگا جاتے۔

میں تھانے چلا گیا اور مہتاب کو بتایا کہ اُس کا بھائی فوت ہو گیا ہے۔ اکیس بائیس سال کی عمر کے بھائی کا فوت ہو جانا بہت بڑا حادثہ تھا۔ مہتاب کی تو دھاڑیں نکل گئیں۔ میں نے اُسے کہا کہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرے اور مجھے کچھ بتائے تاکہ میں قاتلوں کو جلدی گرفتار کروں۔ میری توقع تھی کہ کسی خاندان کی نشاندہی کرے گا کہ اُس کے ساتھ دشمنی ہے، پھر میں ملزموں کو جا کر پکڑ لوں گا لیکن اُس نے مجھے مایوس کر دیا۔

"ہمارے خاندان کی یہ روایت ہے کہ کسی کو اپنا دشمن نہیں بناتا۔" مہتاب نے کہا —— "گاؤں میں اونچ نیچ، نیکی بدی لگی رہتی ہے لیکن

ایسی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں کہ کوئی ہمارا فصل جلا جائے اور میرے بھائی کو قتل کر دے" ——— اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ——— "اب دشمنی رکھ کر دکھاؤں گا۔ اپنے بھائی کے خون کا بدلہ اپنے ہاتھوں سے لوں گا۔"

میں نے اُسے کوئی پند اور نصیحت نہ کی کہ وہ ایسی باتیں نہ سوچے اُس کا نوجوان بھائی مارا گیا تھا۔ وہ تو غم اور غصّے سے پھٹ رہا تھا۔ اس ذہنی اور جذباتی حالت میں آدمی ہر کسی پر شک کرتا ہے اور جس کے ساتھ ذرا سی بھی رنجش ہوتی ہے اُس کا بھی نام مشتبہوں میں لکھوا دیتا ہے، لیکن مہتاب کہہ رہا تھا کہ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں اور کسی پر شک بھی نہیں۔

"کیا تم نذرے ڈکیت پر بھی شک نہیں کرو گے؟" ——— میں نے پوچھا۔

نذرا ڈکیت وہ شخص تھا جس کے تین آدمی ڈکیتی میں پکڑے گئے تھے اور مہتاب گواہ تھا۔ اسے نذرے نے دھمکیاں دی تھیں۔ وہ مہتاب کو گواہی دینے سے روک رہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ تینوں ملزموں کو سزا سنائی گئی تھی تو وہ عدالت سے نکلے۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ ان میں سے وہ میرے پاس رُک گیا جسے مہتاب نے پکڑا اور پہچانا تھا۔

"اپنے گواہ کو سنبھال کر رکھنا ملک جی!" ——— اُس نے مجھے کہا تھا ——— "اس کی زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔"

جس کانسٹیبل نے اُس کے ہاتھوں کو لگی ہوئی ہتھکڑی کی زنجیر پکڑ رکھی تھی، اُس نے اس ڈکیت کو گالی دے کر زنجیر کھینچی اور اُسے مجھ سے دُور لے گیا۔ میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا تھا۔ سزا سن کر اکثر مجرم خفت مٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ کہا کرتے ہیں مگر مہتاب کے بھائی کے قتل کے بعد مجھے اس مجرم کی دھمکی یاد آئی تو میں نے محسوس کیا کہ یہ

خالی دھمکی نہیں تھی۔ نذرے ڈکیت نے مہتاب کو قتل کروانے کی بجائے اس کا کھلیان جلانا انتقام کا زیادہ اچھا طریقہ سمجھا ہو گا۔

"ہاں جناب!" ——— مہتاب نے کہا ——— "یہ ڈکیت تو میرے دماغ میں آئے ہی نہیں تھے ...... ان کا کوئی پیرا استاد ہے جو فصل پکنے کے انتظار میں رہا۔"

"میرا خیال ہے وہ تمہارے بھائی کو قتل نہیں کرنا چاہتے تھے۔" میں نے کہا ——— "اگر وہ اس ارادے سے آتے تو پہلے تمہارے بھائی کو قتل کرتے پھر کچھ اور کرتے۔ تمہارے بھائی نے مرنے سے پہلے تھوڑا سا بیان دیا ہے۔ اُس کی آنکھ کسی آواز پر کھلی۔ اُس نے اُٹھ کر دیکھا۔ ایک آدمی ایک ڈھیر کو آگ لگا چکا تھا۔ تمہارا بھائی اُس تک گیا تو دو اور آدمی آ گئے جنہوں نے اُسے لاٹھیاں ماریں۔ قتل کی نیّت سے آنے والے کلہاڑیاں لے کر آتے ہیں۔ ڈکیتوں کے پاس خنجر اور چاقو ہوتے ہیں۔"

زندہ رہی تو پاگل ہو جائے گی

یہ تو میرا شک تھا کہ یہ واردات نذرے ڈکیت کی ہے۔ میں نے اُسی وقت اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چار پانچ کانسٹیبل فوراً ساتھ لے اور کسی تانگے والے کو گھر سے جگا کر صبح ہونے سے پہلے پہلے نذرے ڈکیت کے گاؤں جائے۔ اُسے اور اُس کے گھر کوئی آدمی ہوں اور گاؤں میں جس پر اُسے شک ہو، ان سب کو مہتاب کے گاؤں میں لے آئے۔

میں صرف اس ایک شک پر انحصار نہیں کر سکتا تھا اور میں نے ہر بات میں مہتاب یا اُس کے باپ پر ہی بھروسہ نہیں کرنا تھا۔ آتش زنی اور قتل بڑا ہی سنگین جرم تھا۔ انگریز افسر ایسے جرم کی

تفتیش میں ایک منٹ کی بھی کوتاہی نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ کیس ایسا نہیں تھا کہ اسے اے۔ایس۔آئی کے حوالے کر دیتا۔ اس میں چونکہ پیشہ ور اور سزا یافتہ مجرموں کا بھی ذکر آتا تھا اس لیے مجھے اپنی پانچوں حسیں اور ایک فالتو حس بیدار کر کے تفتیش کرنی تھی۔ موقعہ پر جانے کے لیے میں کاغذی کارروائی مکمل ہونے کا اور صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

"ایک بات بتاؤ مہتاب!" ــــ میں نے کہا ــــ "یہ نہ کہنا کہ تمہارا بھائی بڑے اچھے چال چلن کا تھا۔ وہ جوان تھا . . . خوبصورت جوان تھا۔ کسی جوان عورت کے ساتھ، کسی جوان لڑکی کے ساتھ اُس کا دوستانہ ہو گا اور اس لڑکی کے بھائیوں نے . . . ."

"آپ بے شک بات پوری نہ کریں" ــــ مہتاب نے کہا ــــ "ہمارے گھر کا دستور طریقہ کچھ اور ہے۔ ہم دو بھائی تھے، دو جوان لڑکے میرے چچا کے ہیں، ایک جوان لڑکا میرے تائے کا ہے۔ آپ مجھ سے نہ پوچھیں۔ گاؤں کے کسی آدمی سے، کسی عورت سے، کسی ہندو سے، کسی سکھ سے ہم سب کے متعلق پوچھ لیں۔ ہم ویسے ہی ہیں جیسا ہمیں دوسرے کہتے ہیں۔"

"دوسروں سے تو میں نے پوچھنا ہی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "تم خود بتا دو تو بہتر ہے۔ میرا وقت بچ جائے گا۔ میں نے تمہارے بھائی کے قاتل کو پکڑنا ہے۔"

"مجھ سے سن لیں" ــــ مہتاب نے کہا ــــ "ہماری برادری کی ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ اُس کے ساتھ میرے بھائی کی اور لڑکی کی میرے بھائی کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ ہیر رانجھے کی کیا ہو گی" ــــ اتنا کہہ کر اُس کے آنسو نکل آئے اور ہچکیاں لے لے کر رو دیا۔ کچھ دیر بعد سنبھل کر کہنے لگا ــــ "یہ لڑکی زندہ

نہیں رہے گی۔ زندہ رہی تو پاگل ہو جائے گی . . . . میرے بھائی نے مجھے بتایا تھا۔ میرے باپ نے اُسی روز اس لڑکی کا رشتہ مانگ لیا اور لڑکی کے ماں باپ نے رشتہ دے دیا۔ اب منگنی کرنی تھی۔"

"اس لڑکی کا رشتہ مانگنے والے اور بھی ہوں گے؟"

"ہیں جی!" ــــ مہتاب نے جواب دیا ــــ "دو تھے دونوں کو ہم سے پہلے جواب مل گیا تھا۔"

"وہ لڑکی والوں سے ناراض ہوتے ہوں گے" ــــ میں نے پوچھا ــــ "انہوں نے کوئی دھمکی دی ہو گی؟"

"نہیں" ــــ مہتاب نے کہا ــــ "گاؤں میں کوئی ایسا نہیں جو ہمیں دھمکی دینے کی جرأت کرے۔"

"کیوں؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "تم لوگوں سے سب ڈرتے ہیں؟"

"دونوں باتیں ہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "ہمارے تین گھروں کے آدمی بڑے جوان ہیں اور سب بڑے دلیر اور نڈر ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارا سلوک ہر کسی کے ساتھ بہت اچھا ہے۔ ہم اپنے مزارعوں اور نوکروں کی بھی عزت کرتے ہیں . . . . ملک صاحب! ہمارے متعلق آپ ہم سے نہ پوچھیں، گاؤں والوں سے پوچھیں۔"

وہ تو میں نے پوچھنا ہی تھا۔ یہ واردات انتقامی کارروائی تھی، اور دشمنی بڑی سخت اور گہری معلوم ہوتی تھی۔ اتنی سنگین کارروائی معمولی دشمنی پر نہیں ہوا کرتی۔ میں نے مہتاب سے اور اُس کے کسی رشتہ دار سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

صبح کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ میری گھوڑی تیار تھی۔ اپنے سٹاف کے جن افراد کو ساتھ لینا تھا انہیں مہتاب اور اُس کے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں کے ساتھ گاؤں پہنچنے کے لیے کہا۔ میں ہسپتال چلا گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھنی تھی جو کچھ وقت بعد ملی۔ سر کی ضربیں مہلک نہیں تھیں۔ ضرب

وہ مہلک ثابت ہوئی جو مقتول کے پیٹ پر پسلیوں سے ذرا نیچے لگی۔ وہ پیٹھ پر گرا ہوگا اور اُسے اوپر سے لاٹھی ماری گئی۔ اس سے تلی پھٹ گئی اور جگر کو بھی خاصا نقصان پہنچا تھا۔

یہ بڑا گاؤں تھا۔ میں نے نمبردار کی ڈیوڑھی کو تفتیشی ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ ذیلدار، سفید پوش اور تھانیداروں کے پیشہ ور خوشامدی جن میں دو دس نمبریئے بدمعاش بھی تھے اور تین چار معزز افراد بھی، اس طرح دوڑے آئے جیسے آسمان سے فرشتہ اُترا ہو۔ یہ ان لوگوں کا دستور تھا۔ پولیس کے لیے یہ لوگ مددگار ثابت ہوتے تھے۔

میں سب سے پہلے موقعہ پر گیا۔ وہاں ملزموں کے کھُروں کی توقع ہی نہیں تھی۔ سارا گاؤں وہاں گیا تھا۔ ایک ڈھیر جلا ہُوا اور بکھرا ہُوا تھا۔ مقتول کی چارپائی وہاں نہیں تھی۔ اُسے بیہوشی کی حالت میں اس چارپائی پر ڈال کر تھانے لے گئے تھے۔ اُس کی کلہاڑی بھی وہاں نہیں تھی۔ مختصر یہ کہ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ مجھے تفتیش میں مدد دیتی۔

صبح ہو چکی تھی۔ میں نمبردار کی ڈیوڑھی میں جا بیٹھا اور اُس سے رپورٹ لینے لگا۔

"سب سے پہلے مجھے مقتول کے متعلق بتاؤ" ——— میں نے کہا ——— "اس خاندان کے ساتھ تمہاری دوستی ہے یا دشمنی، یہ دماغ سے نکال کر بات کرنا۔ . . . . تم جانتے ہو، میں کیا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مقتول چال چلن کا کیسا تھا؟"

"رضا (مقتول) بدمعاش نہیں تھا" ——— نمبردار نے جواب دیا ——— "اور وہ سفلہ بھی نہیں تھا۔ جوشیلا ضرور تھا۔ رعب رکھنے والا لڑکا تھا لیکن بڑکیں مارنے والا نہیں تھا۔"

"عورت کے معاملے میں کیسا تھا؟"

"صاف تھا جی!" ——— نمبردار نے کہا ——— "بالکل صاف۔ ایک لڑکی کے ساتھ اُس کا پیار محبت ہو گیا تھا۔ اُس کے باپ نے یہ

عقلمندی کی کہ اس لڑکی کا رشتہ اس کے ساتھ پکا کرا لیا۔"

"اس لڑکی کو چاہنے والا کوئی اور بھی ہوگا۔"

"کسی نے اپنا سر کھلوانا تھا اس لڑکی کی طرف دیکھ کر!" ——— نمبردار نے کہا ——— "بڑے معزز خاندان کی لڑکی ہے۔ یہ تو مجھے میری گھر والی نے بتایا تھا کہ اس لڑکی کا دل رضا کے ساتھ لگا ہُوا ہے۔ ان کی آپس کی محبت نے انہیں بدنام نہیں کیا۔"

نمبردار مجھے کوری تختی دکھا رہا تھا۔ میں کیسے مان لیتا کہ دشمنی کے بغیر اتنی سنگین واردات ہو گئی ہے۔

یتیم اور شریف لڑکی کو بدنام کر دیا

"پھر اس خاندان کی کسی سے دشمنی ہو گی!" ——— میں نے کہا ——— "خاندان کے کسی آدمی کی کسی سے دشمنی ہو گی؛ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ نمبردار ہو تم!"

"مہتاب نے اپنے سسرال کے ساتھ دشمنی مُول لے لی ہے"۔ نمبردار نے کہا ——— "پندرہ بیس دنوں سے مہتاب کی بیوی اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کے ماں باپ اور بھائی کہتے ہیں کہ ہم لڑکی کو نہیں بھیجیں گے اور مہتاب اور اس کے ماں باپ کہتے ہیں کہ لڑکی کو بسانا ہے تو خود چھوڑ کر جاؤ، ہم نہیں لائیں گے۔"

"وجہ کیا ہے؟"

"میں آپ کو ساری بات سناتا ہوں" ——— نمبردار نے کہا ——— "مہتاب کی بیوی چار پانچ مہینوں سے یہ شک کر رہی تھی کہ مہتاب نے ایک لڑکی کے ساتھ تعلق پیدا کر لیا ہے۔ اسی پر بات یہاں تک بڑھ گئی کہ مہتاب کی بیوی اپنے گھر چلی گئی۔ کہتی تھی کہ مہتاب نے اُسے مارا پیٹا ہے . . . . میں نہیں مانتا کہ مہتاب نے اس لڑکی کے ساتھ

تعلق پیدا کیا ہوگا۔ اُس کی بیوی کسی اور کا نام لیتی تو شاید ہم مان لیتے ۔

اُس نے جس لڑکی کا نام لیا ہے وہ ایک بڑی شریف بیوہ کی لڑکی ہے ۔ بیٹی ماں سے بڑھ کر حیادار ہے ۔ اُس پر کوئی انگلی نہیں اُٹھا سکتا ۔ یہ ماں بیٹی کسی کی محتاج نہیں ۔ گاؤں میں کسی کی کوئی ایسی ویسی حرکت یا کسی مرد اور عورت کی دوستی چھپی نہیں رہ سکتی ۔ مہتاب کو ہم نے تین چار دفعہ اس بیوہ کے گھر آتے جاتے دیکھا ہے لیکن کوئی بھی ایسا شک نہیں کرتا جیسا مہتاب کی بیوی نے کیا ہے۔"

"مہتاب کے سالے کیسے ہیں؟"

"لٹھ باز ہیں" ـــــ نمبردار نے جواب دیا ـــــ "ہر کسی کے سر پر چڑھ کر بات کرتے ہیں ۔ مہتاب کے خاندان سے وہ بہت مختلف ہیں۔"

"تم پرانے تجربہ کار نمبردار ہو" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم جانتے ہو کہ میں کیا معلوم کرنا چاہتا ہوں ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ مہتاب کے سسرال والے اس قسم کے لوگ ہیں کہ انہوں نے اتنی سنگین انتقامی کارروائی کی ہو گی کہ ان کی فصل جلا ڈالی اور ایک جوان آدمی کو قتل کر دیا۔"

"یہ ہو سکتا ہے" ـــــ نمبردار نے جواب دیا ـــــ "اُن لوگوں نے دھمکیاں دی تھیں کہ ہم اپنی بہن کی بے عزتی کا بدلہ لیں گے۔ ادھر مہتاب تو ذرا ٹھنڈا تھا لیکن رضا بڑے سخت جوش میں آیا ہوا تھا ۔ پانچ چھ دن ہوئے اس نے باہر کھڑے کھڑے للکار کر کہا تھا کہ جو بدلہ لینے کی بات کرے گا اُسے ہم پہلے ہی بدلے کے قابل نہیں چھوڑیں گے ۔ رضا نے یہ تو کئی بار للکار کر کہا تھا کہ ہم طلاق بھی نہیں دیں گے اور اس عورت کو گھر بھی نہیں لائیں گے۔"

"رضا کی للکار کے جواب میں اُن لوگوں کا رویہ کیسا تھا؟"

"وہ تو سخت غصے میں تھے جی!" ـــــ نمبردار نے جواب دیا ـــــ

"کہتے تھے کہ ان لوگوں کو ہم اپنا آپ دکھائیں گے .... میں نے ایک بار مہتاب سے بات کی تھی۔ مہتاب کہتا تھا کہ اپنی بیوی کے خلاف مجھے کوئی شکایت نہیں لیکن اُس نے میرے خلاف جو بکواس مشہور کر دی ہے یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اپنی بے عزتی شاید برداشت کر لوں لیکن اس عورت نے ایک یتیم اور شریف لڑکی کو بدنام کر دیا ہے۔"

"تم نے مہتاب کے سالوں سے بات نہیں کی؟"

"کی تھی ملک صاحب!" ـــــ نمبردار نے جواب دیا ـــــ "میں چاہتا تھا کہ ان میں صلح صفائی ہو جاتے لیکن وہ تو مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے .... اب یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے کہ اس نوجوان لڑکے کو اُنہوں نے قتل کیا ہے یا نہیں۔"

میں نے نمبردار سے اس سلسلے میں چھوٹی چھوٹی کئی ایک باتیں پوچھیں۔ اس کے جواب ایسے تھے کہ مہتاب کے سالوں پر میرا شک پکا ہوتا گیا۔ اس کے بعد میں نے ذیلدار کو بلایا۔ یہ شخص نمبردار سے زیادہ سیانا تھا۔ اس نے بھی یہی بات سنائی بلکہ نمبردار کی ہر بات کی اُس نے تصدیق کر دی۔ ذیلدار نے بھی اس لڑکی کے چال چلن اور شرم وحیا کی تعریف کی۔

یہ بڑا قیمتی سراغ تھا جو ان لوگوں نے مجھے دیا۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے سفید پوش اور دو معززین کو باری باری بلایا۔ انہوں نے بھی یہی باتیں سنائیں۔ میں حیران تھا کہ یہ بیوہ عورت اور اس کی بیٹی اتنی ہی زیادہ شریف تھیں کہ جس نے بھی اُن کی بات کی تو ساتھ یہ ضرور کہا کہ یہ تو بہت نیک اور شرم پردے والی ہیں۔ یہ سوچ بھی آتی تھی کہ مہتاب کی بیوی نے مہتاب پر کیوں شک کیا ہے۔ ... میں پولیس آفیسر تھا۔ مجھے گہرائی میں جانا تھا۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی کہ مہتاب کی بیوی گھر جا بیٹھی تھی۔ ایک سوال یہ بھی ذہن میں آیا کہ میں

مہتاب سے پوچھتا رہا کہ اُس کی دشمنی کسی کے ساتھ ہے یا نہیں لیکن اُس نے اپنے سسرال کا اور اپنی بیوی کی ناراضگی کا ذکر تک نہ کیا۔ اس سے میں یہی مطلب لے سکتا تھا کہ مہتاب اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہے۔

پہلے میں نے سوچا کہ مہتاب کو بلا کر اُس سے پوچھوں کہ یہ کیا سلسلہ ہے اور یہ بھی پوچھوں کہ اُس نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی کیوں۔ میں تو اب اس لائن پر سوچنے لگا تھا کہ آتش زنی اور قتل کے مجرم مہتاب کے سالے ہیں۔ مجھے دوسری سوجھ آئی کہ مہتاب سے نہ پوچھوں۔ پہلے دوسروں سے پوچھ گچھ کر لوں۔ اس معاملے میں مجھے صرف مہتاب پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

ایک اور بات میرے ذہن میں اٹک گئی تھی۔ میں نے مہتاب اور اُس کی بیوی کے متعلق اتنے سارے آدمیوں سے پوچھ گچھ کی تھی۔ اُنہوں نے بتایا تھا کہ مہتاب کی بیوی سانولے رنگ کی اور گول اور ذرا بھاری جسم کی عورت ہے۔ اس کے مقابلے میں مہتاب خوبرو تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ مہتاب کی اپنی بیوی کے ساتھ ویسے بھی نہیں بنتی تھی۔ ان میں کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ لڑائی جھگڑے اس لڑکی پر شروع ہوتے تھے۔

میں نے مہتاب کے چاروں سالوں، ان کے باپ اور مہتاب کی بیوی کو بلا لیا۔ اُس کی بیوی کا میں نے یہ احترام کیا کہ ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ یہ عورت آئے تو اسے نمبردار کے گھر میں بٹھائے۔ باقی سب کو باہر بٹھانا تھا۔

ان کے آنے سے پہلے اے۔ ایس۔ آئی نذرے ڈکیت اور دو آدمیوں کو لے آیا۔ یہ دونوں اُس کے گھر سوئے ہوئے تھے۔ میں نے نذرے کو ڈیوڑھی میں بلا کر کہا کہ قمیص اتارو۔ اُس نے قمیص اتاری تو میں نے اس کے جسم کو ہر طرف سے دیکھا۔ پھر دروازے بند کر کے اُس

کی شلوار بھی اُتروائی۔ اُس کے جسم پر جلن کا ذرا سا بھی نشان نہیں تھا۔ میرے سامنے رضا مقتول کا نزعی بیان تھا۔ ڈھیر کو آگ لگانے والے کو اُس نے دھکا دیا تھا اور شاید وہ آدمی آگ میں گرا تھا۔ مقتول کے الفاظ صاف نہیں تھے۔ میں نے یہ شک اپنے ذہن میں رکھ لیا تھا۔

"نذرے!" —— وہ کپڑے پہن چکا تو میں نے اُسے فرش پر بٹھا کر کہا —— "مہتاب کے بھائی کو تم نے مارا ہے یا مروایا ہے۔ اس کے کھلیان کو آگ تم نے ہی لگوائی ہے۔"

"اوہ سرکار!" —— اُس نے آگے ہو کر میرے پاؤں پکڑ لئے پھر ہاتھ جوڑ کر بولا —— "یہ واردات میری نہیں نہ میرے کسی آدمی کی ہے۔"

"یہ تو میں جانتا تھا کہ تم انکار کرو گے" —— میں نے کہا —— "اقرار کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔"

وہ میری منت سماجت اور انکار کرتا رہا۔ میں نے اُسے یاد دلایا کہ وہ مہتاب کو گواہی سے ہٹانا چاہتا تھا اور اُس نے مہتاب کو دھمکیاں دی تھیں۔

"میں مانتا ہوں کہ وہ تینوں میرے آدمی تھے" — اُس نے کہا — "میں یہ بھی مانتا ہوں کہ میں مہتاب کو گواہی سے توڑنا چاہتا تھا اور میں نے اُسے دھمکیاں بھی بھیجی تھیں، لیکن میں نے یہ واردات نہیں کی جو آپ بتا رہے ہیں۔"

"تم جانتے ہو نذرے، میں تمہارا کیا حال کر دوں گا" — میں نے کہا —— "اتنی جلدی چھوڑوں گا نہیں ...... جاؤ باہر بیٹھو اور سوچو۔"

اُسے باہر بھیج کر اُس کے ایک ساتھی کو بلایا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ نذرے کا دوست ہے اور دو دنوں کے لیے اُس کے پاس آیا ہوا ہے۔ میں نے اُس کے بھی کپڑے اُتروا کر دیکھا۔ یہ بھی

صاف تھا۔ اس سے رضا کے قتل کا پوچھا تو اُس نے کہا کہ وہ جرائم پیشہ نہیں۔ اُس نے اپنے گاؤں کا نام کچھ اور بتایا۔

"یہ تو میں معلوم کر لوں گا کہ تم کون سے گاؤں کے رہنے والے ہو اور کیا ہو؟" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اگر وعدہ معاف گواہ بننا ہے تو میں بنا لوں گا۔"

وہ انکار ہی کرتا رہا۔ میں نے اُسے باہر بھیج کر اس کے دوسرے ساتھی کو بلایا۔ اُس کے کپڑے اُتروائے۔ اُس کے جسم پر بھی تازہ جلن کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اُسے بھی میں نے کہا کہ وعدہ معاف گواہ بن جائے۔

"حضور!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "وعدہ معاف گواہ کس واردات کا بنوں؟"

اسے بھی میں نے باہر بٹھا دیا۔ ان لوگوں کے ساتھ ہم دوسرا طریقہ استعمال کیا کرتے تھے۔

اگر لڑکی رات کو آئے ....

لاش گھر میں آ گئی تھی۔ کہرام ایسا کہ برداشت نہیں ہوتا تھا۔ میں نے مہتاب کے سسر کو بلایا۔ ڈیل ڈول اور لباس سے معزز زمیندار لگتا تھا۔

"چوہدری صاحب!" ـــــ میں نے اُس سے پوچھا ـــــ "آپ کی بیٹی میکے کیوں بیٹھی ہوئی ہے؟"

"بڑے لوگوں سے واسطہ پڑ جائے تو یہی کچھ ہوتا ہے" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "اُس کا خاوند ایک لڑکی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ میری بیٹی اُسے روکتی تھی۔ وہ باز نہیں آتا تھا۔ اسی پر اُس نے میری بیٹی کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے اُسے سمجھایا۔ میرے بیٹوں نے سمجھایا لیکن اُس نے کچھ سمجھنے کی بجائے میری بیٹی کو گھر سے نکال دیا۔"

"چوہدری صاحب!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "ایک بار پھر

سوچ کر بتائیں۔ کیا آپ کی بیٹی خود آپ کے پاس گئی تھی یا خاوند نے اُسے نکال دیا تھا؟"

"خاوند نے گھر سے نکال دیا تھا" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

"آپ نے مہتاب کے ماں باپ سے بات نہیں کی؟"

"وہ بھی اپنے بیٹے جیسے بے غیرت ہیں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں نے اس لیے مہتاب سے بات نہ کی کہ اُس نے کوئی الٹی سیدھی بات مُنہ سے نکالی تو برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

"برداشت نہ کر سکنے کی صورت میں آپ کیا کرتے؟"

"ایک دو سُناتا" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ

"اگر وہ دو کی چار سُناتا تو پھر؟"

"پھر مجھ سے اپنے دانت تڑواتا" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "ہم کسی کا لحاظ نہیں کیا کرتے۔"

"لحاظ کرنا بھی نہیں چاہیے" ـــــ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا ـــــ "ماشاء اللہ آپ کے چار بیٹے ہیں۔"

"ہاں جی!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "گاؤں میں کوئی سر اُونچا نہیں کر سکتا۔"

"اور اب تو لوگ آپ کے بیٹوں کے سائے سے بھی بھاگیں گے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "لیکن آپ کے بیٹوں نے غیرت والے مردوں والا کام نہیں کیا۔"

"کون سا کام؟" ـــــ اُس نے دبی سی آواز میں پوچھا۔

"یہی جو انہوں نے کیا ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اُنہیں چاہیے تھا کہ مہتاب اور رضا کو گاؤں میں للکارتے اور دونوں کو قتل کرتے۔ چوروں کی طرح آدھی رات کو جا کر کھلیان کو آگ لگائی اور تین بھائیوں نے مل کر نہتے آدمی کو قتل کر دیا۔"

"نہ جنابِ عالی!" ـــــ اُس نے بدک کر کہا ـــــ "میرے بیٹوں

نے رضا کو قتل نہیں کیا نہ اُن کے کھلیان کو آگ لگائی ہے۔ رضا کے ساتھ اُن کی کیا دشمنی تھی، مارنا تھا تو مہتاب کو مارتے۔"

"جناب چوہدری صاحب!" ——— میں نے کہا ——— "میں یہ مان لیتا ہوں کہ آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے بیٹوں نے یہ جرم کیا ہے، لیکن میرے پاس یہ ماننے کے لیے شہادت موجود ہے کہ آتش زنی اور قتل کے مجرم آپ کے بیٹے ہیں ..... ابھی یہ معاملہ میرے اختیار میں ہے۔ اگر آپ کو معلوم نہیں تو اپنے بیٹوں کو سمجھائیں کہ مجھے صاف بتا دیں۔ موقعہ کا کوئی گواہ نہیں۔ میں انہیں بچانے کی ترکیب کر لوں گا۔"

"میں نہیں مانتا جناب!" ——— اُس نے حیران اور پریشان ہو کر کہا ——— "میری بیٹی کا معاملہ اتنا سنگین نہیں تھا کہ میرے بیٹے ایک جوان لڑکے کو قتل کر دیتے۔"

"آپ کے دو بیٹے شادی شدہ ہیں" ——— میں نے کہا ——— "دونوں آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے متعلق آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ گذشتہ روز یہ جرم کرنے کے لیے گھر سے غائب ہوئے تھے یا نہیں۔ دوسرے دونوں کا تو آپ کو پتہ ہو گا۔"

"دیکھیں جناب!" ——— اُس نے کہا ——— "میں نے جب شور سُنا کہ کسی کے کھلیان کو آگ لگی ہوئی ہے تو میں جاگ کر باہر نکلا۔ میرے دونوں غیر شادی شدہ بیٹے جوانی کی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ میرے بعد اُٹھے۔ دوسرے دونوں چوبارے میں سوتے ہیں۔ وہ بھی میرے بعد نکلے تھے۔"

"اس سے میری تسلی نہیں ہوتی" ——— میں نے کہا ——— "میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ صاف اور سچی بات کریں اور مجھ سے فائدہ اُٹھائیں۔ میں نے شہادت پر اُنہیں پکڑ لیا تو پھانسی سے کم سزا نہیں ملے گی۔ آپ کے گھر کی تلاشی لوں گا۔ آپ کے دونوں بیٹوں کی بیویوں کو تھانے لے جا کر پوچھ گچھ کروں گا۔ آپ کی بیٹی کو میں نے

پہلے ہی بلایا ہوا ہے۔ اسے گھر جانے کی اجازت دینے کی بجائے اپنے ساتھ تھانے لے جاؤں گا۔"

وہ قسمیں کھانے اور منت سماجت کرنے لگا۔ اُس نے یہی کرنا تھا۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ فوراً مان جاتا۔ میں نے اُسے ڈرا دھمکا کر باہر بھیج دیا اور اُس کے چاروں بیٹوں کو باری باری بلایا اور ہر ایک کے ساتھ خاصا وقت لگایا۔ انکار تو ہر ملزم اور مشتبہ کرتا ہے جو اصل مجرم ہوتا ہے وہ تو بڑے زوردار طریقے سے انکار کرتا ہے لیکن تفتیش کرنے والے انسپکٹر کا دماغ حاضر اور نظر تیز ہو تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ شخص سچا ہے یا جھوٹا۔ مہتاب کے سالوں نے جس طرح انکار کیا اس سے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ان کا انکار غلط نہیں لیکن میں انہیں اتنی جلدی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

"جناب! ہمیں ایسا بے غیرت نہ سمجھیں" ——— بڑے بھائی نے کہا تھا ——— "اس گھر میں ہماری بہن بیاہی ہوئی ہے۔ اس گھر میں اس کے دو بچے پیدا ہوئے ہیں۔ اپنے بہنوئی کے گھر پر ہم ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔"

"تم لوگ تو بہنوئی کو دھمکیاں دیتے رہے ہو" ——— میں نے کہا تھا۔

"آپ کو معلوم ہے جناب!" ——— اُس نے کہا تھا ——— "یہ تو گھروں میں ہوتا ہی ہے۔ لڑکی روٹھ کر گھر آ گئی۔ ادھر ہمارے ماں باپ اَڑ گئے کہ ہم لڑکی کو نہیں بھیجیں گے، خود آ کر لے جاؤ۔ اُدھر لڑکے والے رعب میں آ گئے کہ لڑکی جس طرح گئی تھی اسی طرح خود آ جائے۔ پھر کیا ہوتا جناب! تھوڑے عرصے بعد صلح صفائی ہو جاتی ہے ..... یہ بھی سوچیں جناب! قتل چھوٹا بھائی ہوا ہے۔ ہماری اگر دشمنی تھی تو بڑے بھائی کے ساتھ تھی۔ آپ بار بار کہتے ہیں کہ ہم نے اُن کا فصل جلا دیا۔ یہ تو بزدلوں کا کام ہوتا ہے۔"

"ہم نے انہیں دھمکیاں دی تھیں" ——— یہ اس سے چھوٹے بھائی نے کہا تھا ——— "ہم کو انکار نہیں۔ دھمکیوں کے جواب میں

رضا نے دھمکیاں دی تھیں۔ یہ سب زبانی کلامی معاملہ تھا۔"

اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا ——— "آپ اپنی تفتیش کر رہے ہیں نا، ہم اپنی تفتیش کر رہے ہیں۔ ہمیں پتہ چل گیا کہ رضا کا قاتل کون ہے تو ہم آپ کو نہیں کہیں گے کہ اُس شخص کو گرفتار کر لو۔ ہم کہیں گے کہ ہمیں گرفتار کر لو، ہم نے اُس شخص کو قتل کر دیا ہے اور لاش فلاں جگہ پڑی ہے۔"

میں نے اُن سب کے کپڑے اُتروا کر دیکھا تھا۔ جلن کا زخم کسی کے جسم پر نہیں تھا۔ میں نے اُن سے یہ بھی پوچھا تھا کہ مہتاب پر یہ الزام کہ اُس نے فلاں لڑکی کے ساتھ در پردہ دوستی لگا رکھی ہے کہاں تک درست ہے۔ اس کے جواب میں صرف چھوٹے بھائی نے کہا تھا کہ یہ الزام درست ہے۔ اس سے بڑے نے کہا تھا کہ وہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بڑے دونوں بھائیوں کا کہنا کچھ اور تھا۔

"انسان کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا جناب!" ——— سب سے بڑے بھائی نے کہا تھا ——— "مہتاب ایسا نہیں تھا، اور جس لڑکی کا اُس پر الزام ہماری بہن نے لگایا ہے اُس کی اور اُس کی ماں کی شرافت مشہور ہے۔ ہم اس الزام کو اس لیے مانتے ہیں کہ ہماری بہن کہتی ہے کہ اُسے پکا شک ہے۔ میں نے یہ ضرور دیکھا ہے کہ یہ لڑکی پہلے مہتاب کے گھر بہت کم آتی تھی۔ چار پانچ مہینوں سے زیادہ آنے لگی ہے۔ مہتاب بھی کبھی کبھی اُس کے گھر جاتا ہے۔"

"ہمیں مہتاب پر غصہ اور ہے" ——— بڑے سے چھوٹے بھائی نے کہا تھا ——— "اُس نے ہماری بہن کو دو دفعہ مارا پیٹا تھا۔ ہماری بہن ہمارے پاس آ گئی۔ ہم نے دو عورتوں اور دو آدمیوں کو دن اور رات کے لیے اس کام پر لگا دیا تھا کہ مہتاب کو اور اس لڑکی کو دیکھتے رہیں۔ اگر لڑکی کبھی رات کو مہتاب کے گھر آئے یا مہتاب اُس کے گھر جائے تو ہمیں اطلاع دیں ..... ایک مہینے سے اُوپر عرصہ ہو

گیا ہے، ہمیں اُن کی چوری چوری ملاقات کی کوئی خبر نہ ملی۔ چوکیدار کو ہم نے اس کام کے پیسے دیئے تھے۔"

میں نے اس پر اتنی جرح کی کہ وہ پریشان ہو گیا۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور اس کی حالت یہاں تک پہنچی کہ اُس نے پانی مانگا۔ میں نے اُسے پانی پلایا اور اس کی گھبراہٹ بھی دُور کرنے کی کوشش کی اور اپنی تسلی کر کے فارغ کیا۔

بیوہ کی بیٹی اور رات کی بات

میں نے انہیں بھی باہر بٹھا دیا اور اُن کی بہن کو بُلایا۔ وہ نمبردار کے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے مہتاب کو دیکھا تھا اور اب میں اُس کی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کوئی جوڑ نہیں تھا۔ مہتاب خوبرو آدمی تھا اور بیوی کچھ یوں ہی سی تھی۔ نہ رنگ میں کوئی کشش نہ جسم میں۔ مجھے خیال آیا کہ مہتاب نے اپنی پسند اور تسکین کا ذریعہ بنا لیا ہوگا۔ میں نے اس عورت کو بٹھا لیا۔

"خاوند کے ساتھ تمہارا کیا جھگڑا ہے؟" ——— میں نے اُس سے پوچھا۔

"بدمعاش آدمی ہے" ——— اُس نے جواب دیا۔

"شروع سے بدمعاش ہے؟" ——— میں نے پوچھا ——— "یا اب اُس نے بدمعاشی شروع کی ہے؟"

"پہلے شاید مجھے پتہ نہیں چلا" ——— اُس نے جواب دیا ——— "اب پتہ چلا تو میں نے اُسے روکا۔ وہ مجھ سے ناراض ہونے لگا۔ کہتا تھا کہ وہ بیوہ ماں کی بیٹی ہے اور ہر کوئی ان سے خیر خیریت اور کوئی ضرورت پوچھتا رہتا ہے۔"

اس عورت کا بیان اگر مختصر کر دوں تو بہتر ہے۔ اس نے اپنے

خاوند کے خلاف بڑھا چڑھا کر بیان دیا۔ وہ مجھ سے منوانے کی کوشش میں تھی کہ مہتاب اور اس لڑکی کے آپس میں ناجائز تعلقات ہیں اور اس لڑکی کی خاطر مہتاب نے اُسے مارا پیٹا اور گھر سے نکالا ہے۔ اُس نے یہی کہا کہ مہتاب اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔

"تمہارے بھائیوں کو میں جانتا ہوں" ——— میں نے کہا ——— "یہ چاروں اتنے زبردست اور دلیر ہیں۔ انہوں نے مہتاب کو پھینٹی کیوں نہیں لگائی؟ یہ شخص سیدھا ہو جاتا۔"

"میرے بھائی میری مانتے ہی کہاں ہیں جی!" ——— اُس نے کہا ——— "یہ تو اُلٹا مجھے قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ میں روتی ہوئی گھر گئی اور انہیں بتایا تو بڑے بھائی نے کہا کہ تم اب واپس نہ جانا ورنہ تمہارا خاوند اور زیادہ شیر ہو گا۔ اُس نے پوچھا کہ تم خود آئی ہو یا اُس نے تمہیں گھر سے نکالا ہے۔ میں نے کہا کہ میں خود آئی ہوں۔ بڑے بھائی کے علاوہ باپ نے بھی کہا کہ خاوند تمہیں لینے آئے تو چلی جانا، نہ آئے تو دیکھ لیں گے وہ کیا چاہتا ہے۔"

"تمہارے بھائیوں نے اُسے دھمکیاں تو بہت دی تھیں" ——— میں نے کہا ——— "لیکن انہوں نے کیا کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں جی!" ——— اُس نے کہا ——— "خالی دھمکیاں ہی دیتے رہے۔"

"تم کیا چاہتی تھیں یہ کیا کریں؟" ——— میں نے پوچھا۔

"میرا کچھ رُعب رکھتے" ——— اُس نے کہا ——— "میرے خاوند کے ساتھ، اُس کے ماں باپ کے ساتھ بات کرتے۔"

"سُنا ہے رضا بہت جوش دکھاتا رہا ہے" ——— میں نے کہا ——— "اُس کا تمہارے ساتھ رویہ کیسا تھا؟"

"جوش تو وہ دکھاتا رہا ہے لیکن اُس نے کرنا کچھ بھی نہیں تھا" ——— اُس نے کہا ——— "میں اپنے خاوند کے ساتھ الگ مکان میں رہتی

تھی۔ رضا آتا رہتا تھا۔ میرے ساتھ اُس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ میرے دو بھائیوں کے ساتھ اُس کا بڑا گہرا دوستانہ تھا۔"

میں نے دیکھا کہ اس عورت کے بیان میں جھوٹ بھی شامل تھا، جو اُس کی اپنی ہی زبان سے ظاہر ہو جاتا تھا۔ مثلاً اُس نے کہا کہ خاوند نے اُسے گھر سے نکال دیا تھا۔ پھر اُس نے کہا کہ اُس کے باپ نے اس سے پوچھا کہ خود آئی ہو کہ خاوند نے گھر سے نکالا ہے تو اُس نے کہا کہ میں خود آئی ہوں۔ اس طرح اُس نے تین چار اور جھوٹ بولے۔ میں نے جب اُس پر اُس کے بیان پر جرح کی تو اُس نے اپنی چند اور باتوں کی تردید کی۔

میں نے اندازہ کیا کہ یہ معاملہ اتنا سنگین نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کے بھائیوں کے بیانوں سے میں یہی تاثر لے رہا تھا کہ یہ معاملہ اتنی سنگین واردات تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر بھی میں ان لوگوں کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں ابھی یہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ یہ الزام سے بری ہیں۔

مہتاب کی بیوی کو میں نے کہا کہ وہ اپنے گھر چلی جائے تو وہ جاتے جاتے رُک گئی اور مڑ کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ تو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا کہ دماغی لحاظ سے یہ عورت سُست ہے۔ میرا خیال ہے جسمانی لحاظ سے بھی یہ سُست تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیوں رُک گئی ہے؟

"ایک بات پوچھنی ہے" ——— اُس نے کہا ——— "قتل تو رضا ہُوا ہے لیکن آپ نے مجھ سے میرے گھر کی باتیں پوچھی ہیں۔ میرے اور میرے خاوند کے آپس کے جھگڑے کا اس قتل کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"قتل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں" ——— میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا ——— "میں نے سُنا تھا کہ تمہارا خاوند تمہیں تنگ

کرتا ہے۔ میں یہاں آیا ہوا تھا اس لیے سوچا کہ اسے بھی سیدھا کر دوں گا۔"

وہ چپ رہی اور آہستہ آہستہ چلتی باہر نکل گئی۔

میں نے نذر سے ڈکیت اور اُس کے دونوں ساتھیوں کا دوسرا بندوبست کر دیا تھا۔ انہیں اے۔ ایس۔ آئی لایا تھا۔ میں نے ان سے مختصر سی پوچھ گچھ کر کے انہیں اے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ اس کام کے لیے تھانے بھیج دیا تھا کہ ان سے دوسرے طریقے سے پوچھ گچھ کرے۔ اس طریقے میں پُوچھ کم اور "گچھ" زیادہ ہوتی ہے۔

آدھی رات ہونے کو آئی تھی۔ میں نے اس دوران کھانا بھی کھانا تھا۔ اب مجھے اپنے مخبروں سے رپورٹیں لینی تھیں۔ انہیں اپنی ڈیوٹی کا علم تھا۔ وہ میرے بلاوے کے انتظار میں ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔

میں نے دو کو باری باری بلایا۔ انہوں نے وہی باتیں بتائیں جو نمبردار، ذیلدار وغیرہ سے مجھے معلوم ہو چکی تھیں۔ بیوہ اور اُس کی بیٹی کے متعلق بھی وہی رپورٹ ملی جو دوسرے دے چکے تھے۔ بیوہ کے متعلق یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ کسی کی محتاج نہیں اور اپنی زمینداری پر خود نظر رکھتی ہے۔

اب ان دو آدمیوں نے بتایا کہ اپنے مزارعوں اور گاؤں کے محتاج لوگوں کا بہت خیال رکھتی ہے، ہر کسی کی ضرورت پوری کرتی ہے اور اُس کی بیٹی بہت کم باہر نکلتی ہے۔

ان دو آدمیوں کے بعد چوکیدار کی باری آئی۔ یہ شخص میرے خاص مخبروں سے تھا اور اس کی بیوی تو مخبری کے معاملے میں بڑی کائیاں عورت تھی۔ چوکیدار نے آتے ہی ایسی بات کہی کہ میں کچھ دیر اُس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"یہ لڑکی جو اُس بیوہ کی بیٹی ہے، شریف لڑکی ہے"— اُس نے کہا —"لیکن میں نے ایک رات اُسے مہتاب کے ساتھ کھیتوں کی طرف سے آتے دیکھا تھا۔"

"کس وقت؟"

"سارا گاؤں بڑا گہرا سویا ہوا تھا"— اُس نے جواب دیا —"میں نے چھپ کر دیکھا .... مہتاب اُس کے گھر تک گیا۔ شاداں (لڑکی) اندر چلی گئی۔ مہتاب تھوڑی دیر کھڑا رہا پھر وہ اپنے گھر چلا گیا۔"

"تم نے کسی کو بتایا تھا؟"

"نہ حضور!"— چوکیدار نے کہا —"میں نے جوتے کھانے تھے؟ یہ لوگ گاؤں کے بادشاہ ہیں۔"

"مہتاب کے سالوں نے تمہاری یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ شاداں اور مہتاب پر نظر رکھو"— میں نے کہا —"تم نے انہیں بھی نہیں بتایا؟ انہوں نے تمہیں پیسے دیئے تھے۔"

"یہ بعد کی بات ہے"— اُس نے کہا —"میں نے اُنہیں بہت دن پہلے دیکھا تھا لیکن اُنہیں نہیں بتایا۔ میری بیوی کہنے لگی کہ یہ لوگ دو چار دن لڑ جھگڑ کر ایک ہو جائیں گے، پھر دونوں خاندان سارا غصّہ ہم غریبوں پر نکالیں گے۔"

"لعنت بھیجو شاداں اور مہتاب پر!"— میں نے جھنجھلا کر کہا —"مجھے یہ بتاؤ کہ رضا کو تم نے کبھی کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے؟ اس کا کسی لڑکی کے ساتھ یارانہ تھا؟"

"نہیں حضور!"— اُس نے جواب دیا —"کسی کے دل کا حال خدا کے سوا کون جانتا ہے جی! میں نے اسے کسی لڑکی کے ساتھ نہیں دیکھا۔"

شاداں اور مہتاب کے تعلقات تھے یا نہیں، اس کے ساتھ میری دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ میں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ رضا کے قتل کا باعث کچھ اور ہے اور اس کا تعلق رضا کی ذاتی زندگی کے ساتھ ہے۔

میں چوکیدار کو تو نہیں بتا سکتا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔
میں اُسے کہہ رہا تھا کہ رضا کی خفیہ زندگی کی کوئی خبر دے۔ میں نے صبح ہوتے ہی رضا مقتول کے دوستوں کو بلانا تھا۔

"ایک اور بات ہے ملک حضور!" — چوکیدار نے کہا — "میری بیوی باہر بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کی بھی بات سُن لیں۔ مجھے مہتاب کی کوئی ایسی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے جس کا کسی کو کچھ بھی پتہ نہیں۔"

میں نے اُس کی بیوی کو اندر بُلا لیا اور چوکیدار کو بھی بٹھائے رکھا۔

میں تو بے ہوش ہونے لگی تھی

"اب تم بتاؤ" — میں نے چوکیدار کی بیوی سے پوچھا — "تم کیا خبر لائی ہو؟"

اُس نے ایک گاؤں کا نام لیا جو اس گاؤں سے بمشکل دو میل دُور تھا۔

"وہاں کی ایک عورت ہے جس کی عُمر میرے جتنی ہے" — چوکیدار کی بیوی نے کہا — "ایک بہشتی کی بیوی ہے اور ایک گھر میں کام کرتی ہے۔ میرے ساتھ اس کا بڑا گہرا دوستانہ ہے لیکن آج تک اُسے یہ پتہ نہیں چلا کہ میرا تعلق پولیس کے ساتھ بھی ہے۔ وہ ہمارے گاؤں میں آتی رہتی ہے۔ زیادہ وقت میرے ساتھ گذارتی ہے۔ یہاں کے عالم بہشتی کے گھر بھی جاتی ہے۔ میں تین چار مہینوں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ شاداں (بیوہ کی بیٹی) کے گھر بھی جاتی ہے۔ میں نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا . . .

"ابھی کوئی ایک مہینہ گذر گیا ہے۔ وہ آئی اور باتیں کرتے

کرتے اُس نے مہتاب کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ کہنے لگی کہ اس شخص کو میں ایسا ذلیل کراؤں گی کہ کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا . . . . . میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے بڑی عجیب بات سُنائی۔"

اس عورت نے چوکیدار کی بیوی کو جو بات سُنائی وہ میں آپ کو اپنے الفاظ میں سُنا دیتا ہوں۔ اس عورت کے گاؤں کا جو وہاں سے دو میل دُور تھا، ایک آدمی باغ علی شاداں کو چاہتا تھا اور شاداں اُسے کبھی کبھی رات کو ملتی تھی۔ ان کا تعلق وہ پاک بتاتی تھی۔ باغ علی امیر زمیندار کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور وہ بھائیوں سے زمین الگ کر کے خود مختار ہو گیا تھا۔ اُس نے شادی کی تھی لیکن ایک سال بعد اُس نے بیوی کو طلاق دے دی تھی۔

اس عورت نے چوکیدار کی بیوی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ شاداں اور باغ علی کی پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی۔ شاداں اپنی ماں کے ساتھ کبھی کبھی اُس کے گاؤں میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے جایا کرتی تھی۔ یہ عورت باغ علی کے گھر کام کرتی تھی اور یہ باغ علی کے پیغام شاداں تک پہنچایا کرتی تھی۔

"شاداں نے تو باغ علی کے پیچھے گھر سے نکل آنا تھا" — اس عورت نے چوکیدار کی بیوی کو بتایا — "معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ شاداں نہ آئی۔ باغ علی کا یہ پیغام میں ہی لے کر آئی تھی کہ وہ فلاں جگہ کھڑا ہے اور شاداں آ جائے۔ میں اُس رات شاداں کے استقبال کے لیے باغ علی کے گھر رہی تھی۔ باغ علی گیا اور اکیلا واپس آ گیا۔ مجھے اُس نے اتنا ہی بتایا کہ شاداں نہیں آئی۔ وہ غصّے میں تھا . . . . .

"باغ علی پھر بھی مجھے شاداں کے پاس بھیجتا رہا۔ میں اُس کی ماں سے چوری اُسے باغ علی کا پیغام دے دیتی تھی لیکن شاداں

ٹال دیتی تھی ۔ پھر اُس نے یہ کہا کہ میرے گھر نہ آیا کرو ۔ باغ علی پھر بھی مجھے بھیجتا رہا ۔ ایک روز میں اس گاؤں میں آئی اور شاداں سے مل کر واپس چل پڑی ۔ گاؤں سے نکل کر میں قبرستان سے آگے گئی جہاں زمین نیچے چلی جاتی ہے تو مہتاب میرے سامنے آگیا ۔ اُس نے کوئی بات نہ کی اور مجھے تھپّڑ اور گھونسے مارنے لگا ۔ میں گر پڑی تو اُس نے مجھے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے ....

"میں بہت روئی اور بہت چیخی لیکن وہاں مجھے چھڑانے والا کوئی بھی نہیں تھا ۔ میں تو بے ہوش ہونے لگی تھی ۔ میں نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے اور اُس کے قدموں میں سر رکھ کر روئی ۔ اُس نے کہا ــــ 'آج کے بعد تجھے اس گاؤں میں نہ دیکھوں' ــــ اُس نے گالیاں دے کر کہا ــــ 'یہاں شریفوں کے گھر ناپاک کرنے آتی ہو! .... باغ علی کو بتانا کہ میں نے تیرا کیا حال کیا ہے اور میں نے کیا کہا ہے ۔ اگر باغ علی تجھے کہے کہ جا، شاداں کو یہ بات کہہ آ تو اسے کہنا کہ جب تک اس گاؤں میں مہتاب موجود ہے، میں وہاں نہیں جاؤں گی' ....

"وہ تو چلا گیا لیکن مجھ سے اُٹھا نہیں جاتا تھا ۔ میں بہت بُرے حال میں اپنے گاؤں پہنچی ۔ باغ علی کو بتایا کہ مہتاب نے مجھے مارا پیٹا ہے اور اُس نے یہ الفاظ کہے ہیں ۔ باغ علی غصّے سے لال پیلا ہونے لگا ۔ اُس نے کہا کہ میں مہتاب سے تمہاری اور اپنی بے عزّتی کا بدلہ لوں گا .... آج میں پھر اس گاؤں میں آگئی ہوں ۔ باغ علی کہتا تھا کہ جاؤ لیکن شاداں کے گھر نہیں جاؤں گی ۔ مہتاب نے دیکھ لیا تو جان سے مار دے گا ۔ میں آنے سے انکار کرتی ہوں تو باغ علی مارنے پیٹنے پر آجاتا ہے ۔ آتی ہوں تو مہتاب سے ڈر لگتا ہے ۔ تم ایک کام کرو ۔ شاداں کے گھر جاؤ ۔"

چوکیدار کی بیوی نے اُس سے یہ پوچھا ہی نہیں کہ پیغام کیا

ہے ۔ اُس نے کہا کہ وہ ایسے کام نہیں کیا کرتی ۔ یہ عورت مایوس ہو کر چلی گئی اور خاصی پریشانی کی حالت میں گئی ۔

میں نے جب اس نئی خبر پر غور کیا تو مجھے شاداں پر باغ علی اور مہتاب کی رقابت نظر آنے لگی ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے کچھ اور مشتبہ افراد مل گئے ۔ یقین سے تو کوئی بڑا تجربہ کار انسپکٹر بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ نیا مشتبہ اصل مجرم ہے ۔ یہ تو ٹھونک بجا کر اور کھنگال کر دیکھنا پڑتا ہے کہ مشتبہ اصل میں کیا ہے ۔ مجھے یہ اشارہ ملا تو میں نے اس عورت کو بلانا ضروری سمجھا لیکن بلانا اس طرح تھا کہ باغ علی کو پتہ نہ چلے ۔ یہ احتیاط اس لیے کرنی تھی کہ باغ علی مجرم ہوا تو بچنے کا کوئی انتظام کرلے گا ۔

مجھے سوچ یہ پریشان کر رہی تھی کہ قتل چھوٹا بھائی ہوا ہے، رقابت بڑے بھائی کی تھی ۔ رقابت قتل کا باعث بن سکتی تھی ۔ شاداں کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ بڑی خوبصورت لڑکی ہے ۔ ایسی خوبصورت لڑکی کی رقابت میں آدمی حیوان اور درندے بن جاتے ہیں ۔ ایک سوچ آتی تھی ۔ باغ علی نے مہتاب کا فصل جلا کر اُسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہوگی، اُس کا ارادہ قتل کا نہیں ہوگا ۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاداں کے متعلق ہر کوئی کہتا تھا کہ شریف اور حیادار لڑکی ہے ۔ یہی تعریف اُس کی ماں کی سُنی تھی لیکن بات کیا نکلی ۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ مہتاب کی بیوی کا الزام بالکل صحیح تھا اور اس سے مہتاب کے سالوں پر بھی شک پختہ ہو گیا ۔ نذر سے ڈکیت پر شک ذرا کم ہو گیا ۔

"ستاں!" ــــ میں نے چوکیدار کی بیوی سے کہا ــــ "ایک کام کر ۔ اس عورت کے گاؤں جا اور کسی بہانے اُسے اپنے گھر لے آ ۔ اُسے یہ شک بھی نہ ہو کہ میں نے اُسے بلایا ہے ۔"

چوکیدار کی بیوی سوچ میں پڑ گئی ۔ تجربہ کار اور ہوشیار عورت تھی ۔ کہنے لگی لے آؤں گی ۔ میں نے چوکیدار سے کہا کہ وہ آجائے

تو نمبردار کو بتائے اور نمبردار اُسے تھانے لے آئے ۔

داستان ایک داشتہ کی

دن چڑھا تو میں نے بہتر سمجھا کہ باقی تفتیش تھانے میں کی جائے۔ میں جب تھانے کو چلا تو مہتاب کے چاروں سالے میرے ساتھ تھے۔ مہتاب کو بھی میں نے ساتھ لے لیا تھا لیکن مہتاب نے روتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے بھائی کے جنازے میں شامل نہیں ہو سکے گا۔ تفتیش میں کسی کی ان مجبوریوں کی پرواہ نہیں کی جاتی، لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں بھی مسلمان ہوں۔ میں نے مہتاب سے کہا کہ اگر جنازہ جلدی تیار ہو جائے تو میں بھی جنازہ پڑھ کر جاؤں گا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد جنازہ اٹھا۔ میں بھی اس میں شامل ہوا۔ مہتاب کے سالے بھی جنازے میں شامل تھے۔ اس کے بعد میں ان سب کو اپنے ساتھ لے گیا۔

نذرے اور اُس کے دونوں ساتھیوں کی حالت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ اے۔ ایس۔ آئی نے کل کا دن اور ساری رات انہیں بڑی بُری حالت میں رکھا تھا۔ میں نے نذرے کو بُلایا اور اُسے کہا کہ وہ مان جائے لیکن وہ قسمیں کھاتا تھا اور کہتا تھا کہ اُس نے اپنے آدمیوں کی سزا کا انتقام لینا ہوتا تو پانچ چھ مہینے انتظار نہ کرتا۔

"یہ بھی سوچیں حضور!" ——— اُس نے کہا ——— "مقدمے میں اور بھی گواہ تھے، اکیلا مہتاب تو نہیں تھا کہ میں اُس سے انتقام لیتا۔"

میں نے اس پر یہ کرم کیا کہ اسے اور اُس کے ساتھیوں کو اے۔ ایس۔ آئی سے چھڑا کر الگ بٹھا دیا۔

شام کے چار بجے کے قریب واردات والے گاؤں کا نمبردار باغ علی کی نوکرانی کو تھانے لے آیا۔ یہ چوکیدار کی بیوی کا کارنامہ تھا کہ وہ اس عورت کو کسی بہانے اپنے گاؤں میں لے آئی تھی۔ چوکیدار نے نمبردار کو بتایا۔ نمبردار اس کے گھر گیا اور اس عورت سے کہا کہ تھانے میں تمہاری طلبی ہے۔ وہ بہت پریشان ہوئی۔ کہنے لگی کہ اپنے مالکوں کو بتا کر آئے گی۔ نمبردار نے اُسے کہا کہ اُسے ابھی چلنا پڑے گا، ورنہ تھانے سے کانسٹیبل آئے گا اور اُسے ہتھکڑی لگا کر لے جائے گا۔

میرے سامنے آ کر اس نے منت سماجت شروع کر دی۔ مجھ سے اپنا قصور پوچھتی تھی۔ اپنے بچوں کا واسطہ دے کر کہتی تھی کہ وہ روتے ہوں گے۔ اسے جلدی جانے دیا جائے۔

"میں تمہیں فوراً چھوڑ دوں گا" ——— میں نے کہا ——— "میں تمہیں تانگے پر بھیجوں گا کہ بچوں کے پاس جلدی پہنچ جاؤ۔ شرط یہ ہے کہ میں جو پوچھوں، وہ سچ سچ اور جلدی جلدی بتا دو ..... شاداں اور باغ علی کی پوری بات سُنا دو۔"

اُس نے جس انداز سے لاعلمی کا اظہار کیا کہ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ مکار عورت ہے اور جس طرح میں نے اُس کی ٹھوڑی اور دونوں گال اپنے ایک ہاتھ میں لیے اور اس کا منہ اوپر کر کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، اس سے اُسے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہاں جھوٹ بولنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔

"اس فاحشہ شتاں نے آپ کو بتایا ہو گا" ——— اُس نے کہا ——— "میں نے اسے بہن بنایا ہوا تھا۔"

"فضول باتیں کر کے تم اپنا وقت ضائع کر رہی ہو" ——— میں نے کہا ——— "میرا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ تمہیں حوالات میں جا ڈالوں گا۔ وہاں سوچتی رہنا کہ مجھے یہ بات کس نے بتائی ہے۔ ایک جوان آدمی قتل ہو گیا ہے۔ مجھے شک ہے کہ تم بھی اس قتل میں شامل ہو۔ بیٹھی

رہو تھانے میں ہی۔"

اُس کے آنسو نکل آتے۔ یہ آنسو مکاری والے نہیں تھے۔ میں نے آپ کو اپنی کہانیوں میں کئی بار سنایا ہے کہ بڑے لوگ ان چھوٹے لوگوں کو اپنے گناہوں میں شامل کر لیا کرتے ہیں۔ یہ غریب لوگ پیٹ کی خاطر ان کا ہر ناجائز حکم مانتے ہیں۔ نہ مانیں تو گاؤں میں ان کا جینا حرام ہو جاتا ہے۔ جب بات پولیس تک پہنچتی ہے تو ان غریبوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ مالکوں سے ڈرتے یہ لوگ پولیس کو کچھ نہیں بتاتے۔ پولیس انہیں مار پیٹ کر بات اگلوا لیتی ہے۔ پھر ان کا گاؤں میں رہنا محال ہو جاتا ہے۔

اس چکر میں یہ عورت پس رہی تھی۔ اس نے اسی خطرے کا اظہار کیا جو میں بیان کر چکا ہوں۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے چہرے اور جسم سے پتہ چلتا تھا کہ غربت اس عورت کی خوبصورتی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ اُس کا رنگ صاف تھا، چہرے کے خدوخال اور جسم کی بناوٹ بہت اچھی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس عورت کے جسم کا مالک صرف اس کا خاوند نہیں۔ آقاؤں کی ہر فرمائش پوری کرنا اس قسم کی عورتوں کے فرائض میں شامل تھا۔

میں نے اُسے تسلی دی کہ باغ علی اور اس کے خاندان کے کسی فرد کو پتہ نہیں چلے گا کہ اُس نے مجھے راز کی کوئی بات بتائی ہے۔ میری یہ تسلی بے معنی اور وعدہ جھوٹا تھا۔ باغ علی اگر مجرم تھا تو اس عورت کو میں نے گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کرنا تھا۔ اس کے بعد گاؤں میں اس کے ساتھ بڑی ذاتوں نے جو سلوک کرنا تھا میں وہ بھی جانتا تھا لیکن اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ میں نے تو تفتیش اور مقدمے کے بعد اس واردات کی فائل پرانی فائلوں کے ڈھیر میں پھینک دینی تھی۔

اُس نے بالکل وہی بات سُنائی جو وہ چوکیدار کی بیوی کو سُنا

چکی تھی۔ مجھے اس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ باغ علی اور شاداں کی پہلی ملاقات کہاں ہوتی تھی، پھر بھی اُس نے بتا دیا۔ شاداں کی ماں باغ علی کے گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں جایا کرتی اور دو دو تین تین دن وہیں رہتی تھی۔ ایک شادی پر باغ علی اور شاداں آمنے سامنے آتے۔ باغ علی خوبرو اور زندہ دل جوان تھا۔ شاداں کو اُس کا ہنسی مذاق اچھا لگا پھر ان کی کہیں علیحدہ ملاقات ہوئی۔

"میں تو شاداں کو بڑی شریف لڑکی سمجھتا تھا" ——— میں نے کہا۔

"میں نے اُسے بدمعاش تو نہیں کہا" ——— اس عورت نے کہا ——— "شاداں نے اپنی شرافت کو خراب نہیں ہونے دیا۔ باغ علی مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ وہ شریف آدمی نہیں۔ اس کی دوستی بدمعاشوں کے ساتھ ہے۔ وہ مجھے کہا کرتا ہے کہ میں شاداں کو دوسری لائن پر چلانا چاہتا ہوں مگر وہ پاک محبت کرنا چاہتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اُس پر ظاہر ہو کہ میری نیت خراب ہے...."

"آپ شاید یقین نہ کریں، میں اُسے کہتی تھی کہ شاداں شریف کنواری اور یتیم لڑکی ہے، اسے دھوکہ نہ دو، لیکن وہ کسی اور قماش کا آدمی تھا۔ اُس کی بیوی کو مرے ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔ اُسے اچھے سے اچھا رشتہ مل رہا تھا لیکن وہ گھر آباد کرنے کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا۔ میں اُس سے آٹھ نو سال بڑی ہوں۔ مجھے کہتا ہے کہ تم جو ہو پھر شادی کی کیا ضرورت ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اُس کی داشتہ ہو" ——— میں نے کہا۔

"تو اور کیا اُس نے مجھے اپنی ماں بنا کر رکھا ہوا ہے؟" ——— اُس نے بے تکلفی سے کہا ——— "مجھے کہتا تھا کہ شاداں کو اس طرف لاؤ۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ ملوا دینا میرا کام ہے، آگے تمہارا کام ہے کہ

اُس کے ساتھ کیا سلوک کرو . . . . شاداں اتنی پکی تھی کہ وہ غلط بات پر نہیں آتی تھی ۔ باغ علی بہت مایوس ہوتا تھا ۔ میں نے اُسے کہا کہ شاداں کی ماں سے اُس کا رشتہ مانگ لو ۔ اُس نے کہا کہ اس طرح وہ ساری عمر کے لیے گلے پڑ جائے گی۔"

"اُن کی ملاقاتیں ہوتی ہی رہتی تھیں؟"

"اتنی نہیں جی!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "اس تھوڑے سے عرصے میں چار پانچ بار وہ ملے ہوں گے ۔ میں شاداں کو پیغام دے آتی تھی ۔ شاداں رات کو ماں کے سو جانے کے بعد گھر سے کھسک آتی اور کھیتوں میں تھوڑی سی دیر کے لیئے باغ علی سے ملتی اور چلی جاتی تھی . . . . ایک بار شاداں نے مجھے بتایا کہ اُس کی ماں اس کے رشتے کی باتیں کر رہی ہے ۔ گاؤں کے ایک لڑکے کی وہ باتیں کرتی تھی جو اسے پسند نہیں تھا۔"

محبت کرنے والی لڑکی چاہیئے

"میں یہ سننا چاہتا ہوں کہ مہتاب کا اس لڑکی کے ساتھ کیا تعلق ہے" ـــــ میں نے جھنجھلا کر پوچھا ـــــ "اتنی لمبی کہانیاں مت سناؤ۔"

"یہ تو مجھے سنانی پڑیں گی" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "پھر آپ کہیں گے کہ یہ کیسے ہوا اور وہ کیسے ہوا . . . . شاداں کو شک ہوا کہ اُس کی ماں اُسے کسی اور کے ساتھ بیاہ رہی ہے ۔ باغ علی کو اُس نے بتایا ۔ باغ علی نے اپنی اُستادی چلائی اور لڑکی کو راضی کر لیا کہ وہ گھر سے اپنا زیور لے کر اس کے ساتھ گھر سے بھاگ آئے ۔ یہ پیغام میں ہی لے کر گئی تھی ۔ شاداں نے کہا کہ آج رات آجاؤں گی . . . .

"باغ علی اس رات مجھے یہ بتا کر ادھر آیا کہ شاداں کو لینے جا رہا

ہے ۔ مجھے شاداں پر بہت ترس آیا ۔ باغ علی اُسے خراب کرنے کے لیے لا رہا تھا لیکن میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی ۔ باغ علی آیا ۔ اس کے ساتھ دو اور آدمی تھے۔"

میرے پُوچھنے پر اُس نے دونوں آدمیوں کے نام بتائے ۔ میں نے ان آدمیوں کے متعلق مزید پوچھا کیونکہ اس گاؤں میں ان ناموں کے دو بدمعاش رہتے تھے ۔ دونوں دس نمبرئیے تھے ۔ اُس نے بتایا کہ یہ وہی ہیں ۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ باغ علی کا دوستانہ اسی قسم کے بدمعاشوں کے ساتھ ہے ۔

"ہاں، آگے چلو" ـــــ میں نے اس عورت سے کہا ۔

"باغ علی شاداں کے بغیر واپس آگیا" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں نے پوچھا تو اُس نے اتنا ہی بتایا کہ وہ نہیں آئی ۔ وہ پریشانی اور غصّے کی حالت میں تھا ۔ اُس نے مجھے کہا کہ کل شاداں کے گاؤں جا کر کہنا کہ تم نے اچھا نہیں کیا ۔ اب بتاؤ میں کب آؤں ۔ شاداں نے جواب دیا کہ پھر کبھی بتاؤں گی . . . . باغ علی نے مجھے چار پانچ بار شاداں کے پاس بھیجا ۔ کبھی پیغام محبت کا ہوتا تھا اور کبھی دھمکی کا کہ مجھے ناراض کرو گی تو بدنام ہو جاؤ گی ۔ شاداں نے آخر صاف جواب دے دیا اور مجھے کہا کہ یہاں نہ آیا کرو . . . .

"باغ علی پکا اُستاد ہے ۔ ایک روز شاداں کی ماں ہمارے گاؤں میں آئی تو باغ علی اسے اپنے گھر لے آیا اور اُس کے آگے رو کر کہا کہ اس کے گھر میں دولت ہے، عزّت ہے، حیثیت ہے لیکن گھر ویران ہے ۔ اُس نے ایسا رو کر دکھایا اور ایسی باتیں کیں کہ شاداں کی ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے ۔ تب باغ علی نے اُسے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ اُسے دے دے . . . .

"اُس نے یہ بھی کہا کہ گاؤں میں جس سے بھی میرے متعلق پوچھو گی خالہ، وہ کہے گا کہ باغ علی اچھا آدمی نہیں، بدمعاشوں کا دوست ہے ۔

وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ خالہ، میں کیا کروں؟ گھر میں دل نہیں لگتا۔ بھٹکتا پھرتا ہوں۔ میرا گھر آباد ہو جائے تو میں سوائے کام کے باہر قدم بھی نہ رکھوں۔ رشتے ملتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ میری جائیداد کا کوئی حقہ دار نہیں۔ وہ اپنی بیٹیاں میری جائیداد کو دینا چاہتے ہیں۔ مجھے محبت کرنے والی لڑکی چاہیئے جس کو میرا دل قبول کرے اور وہ شاداں ہے۔"

باغ علی کی یہ نوکرانی یاداشتہ جو مجھے بیان دے رہی تھی چونکہ عورت تھی اس لیے وہ ہر بات ہر ایک تفصیل کے بیان کر کے کرتی تھی۔ پہلے تو وہ بولتی ہی نہیں تھی اور بولنے پر آئی تو وہ چپ ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں اس کی زبان میں اس کا بیان سنانے لگوں تو پچاس صفحے صرف اس کے بیان کے ہو جائیں۔ میں اسے ذرا اختصار سے سناتا ہوں۔

باغ علی نے چرب زبانی کا ایسا کمال کر دکھایا کہ شاداں کی ماں سے اقرار کرا لیا کہ وہ اسے شاداں کا رشتہ دے دے گی۔ ابھی شاداں کی ماں نے پکا وعدہ نہیں کیا تھا۔ دو روز بعد باغ علی نے اپنی اس نوکرانی کو شاداں کی ماں کے پاس بھیجا کہ شادی کا دن مقرر کر دو اور جس روز شاداں میرے گھر آئے گی میں اپنا چوبارہ اور آدھی زمین شاداں کے نام کر دوں گا۔ ماں نے کہا کہ میں نے وعدہ کر دیا ہے، شادی کا دن بھی مقرر کر دوں گی۔

باغ علی کی نوکرانی ایک بار پھر آئی تو وہ واقعہ ہوا جو اس عورت نے چوکیدار کی بیوی کو سنایا تھا۔ مہتاب نے اسے راستے میں روک لیا اور اس کی خوب پٹائی کی تھی۔

اس کے بعد باغ علی نے اس عورت کو شاداں کے گاؤں نہ بھیجا۔ اس واقعہ کے چھ سات روز بعد مہتاب کا بھائی قتل ہو گیا۔

اس عورت کو میں نے باہر بٹھا دیا اور مہتاب کو بلایا۔

"تم نے اس عورت کو دیکھا ہے جو ابھی یہاں سے گئی ہے؟" — میں

نے کہا — "وہ باہر ہے۔ نہیں پہچانا تو ایک بار پھر اسے دیکھ لو۔"

"یہ ایک بڑے بدمعاش آدمی کی عورت ہے" — مہتاب نے کہا — "میں شاید اسے کبھی بھول جاؤں گا، یہ مجھے نہیں بھول سکے گی۔"

"اس نے بیان دے دیا ہے" — میں نے کہا — "تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی تھی؟ تم شاید اس راز پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے کہ تمہارا دل شاداں کے ساتھ لگ گیا ہے اور اس لڑکی کے پیچھے تم نے اپنی بیوی کو مارا پیٹا اور اسے اپنے میکے جا بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہے ..... کیا تم شاداں کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"نہیں ملک صاحب!" — اس نے جواب دیا — "یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ میں حیران ہوں کہ آپ اس لڑکی تک پہنچ کس طرح گئے ہیں۔ میں نے یہ معاملہ آپ سے اس لیے چھپایا تھا کہ اس لڑکی کی بدنامی نہ ہو۔"

"کیا تمہیں یہ شک نہیں کہ تمہارے بھائی کو باغ علی نے مروایا ہوگا؟"

"یہ شک میری زبان پر آتا تھا" — مہتاب نے جواب دیا — "لیکن شاداں کی بدنامی کے ڈر سے میں زبان نہیں کھولتا تھا۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ باغ علی بدلہ لیتا تو مجھ سے لیتا، میرے بھائی کے ساتھ اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

اچانک مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ مہتاب جب تھانے میں اپنے بھائی کو بیہوشی کی حالت میں لایا تھا تو اس نے کہا تھا کہ ہر رات وہ خود کھلیان میں سوتا تھا۔ گزشتہ رات اسے بخار ہو گیا تو مقتول نے اسے کہا کہ آج رات وہ گھر میں سوئے۔ کھلیان میں

سونے کے لیے اس کا چھوٹا بھائی رضا چلا گیا۔

"کیا تم ہر رات کھلیان میں سوتے تھے؟"

"ہاں جی!" —— اُس نے جواب دیا —— "میری بیوی روٹھ کر اپنے گھر جا بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا کہ چھوٹے بھائی کو کیوں باہر کھیتوں میں سلاؤں۔ میں خود وہاں سونے لگا۔ چند دنوں کی بات تھی۔ کل رات مجھے بخار ہو گیا تو رضا نے مجھے گھر سے نہ نکلنے دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے موت نے کھلیان میں سونے کا اشارہ دیا ہے۔"

"مہتاب!" —— میں نے کہا —— "میں یقین کے ساتھ تو تمہاری بات سن کر ہی کچھ کہہ سکوں گا۔ اس وقت میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ تمہارا بھائی تمہارے دھوکے میں مارا گیا ہے ... مجھے شاداں کی ساری بات سناؤ۔"

تمہاری بیوی بننے آئی ہوں

"شاداں کی کیا سناؤں جی!" —— اُس نے کہا اور آہ بھر کر کہنے لگا —— "چار پانچ مہینے گذرے، آدھی رات سے کچھ پہلے کا وقت ہو گا، میں اپنے گاؤں کو واپس آ رہا تھا۔ ایک دوست بیمار تھا۔ اِدھر میری ماں بیمار تھی۔ اس لیے اس دوست کے گاؤں سے میں رات کو چل پڑا۔ میں اپنے گاؤں سے کوئی آدھا میل دُور رہ گیا تھا کہ قبرستان سے آگے جو جگہ نیچی ہے وہاں مجھے کسی کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ چاندنی صاف تھی۔ وہاں کھڈ بھی ہیں اور گندم کی فصل بھی کھڑی تھی ....

"میں رُک گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھے، اُنہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں دبک گیا اور پاؤں پر سرکتا ہوا ذرا آگے چلا گیا۔ مجھے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی —— 'نہیں باغ علی! ایسا نہیں

ہو گا۔ میں تمہاری بیوی بننے کے لیے آئی ہوں، یہ دیکھ زیور بھی ساتھ لائی ہوں' —— پھر آدمی کی آواز سنائی دی —— 'بیوی تو بن گئی ہو میری۔ دیکھو شاداں! یہ چاندنی رات کتنی اچھی ہے۔ آؤ، ذرا اِدھر ہو جاؤ ...'

"آدمی کے منہ سے شاداں کا نام سنا تو میں اسے کوئی اور شاداں سمجھا۔ وہ یہ شاداں نہیں ہو سکتی تھی .... ملک صاحب! وہاں ہو یہ رہا تھا کہ یہ آدمی اس لڑکی کو زبردستی خراب کرنے کی کوشش میں تھا اور لڑکی اُسے روک رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ میں تمہاری خاطر گھر سے نکل آئی ہوں اور نکاح کے بغیر مجھے خراب نہ کرو۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ جانے دو، مجھے کیا لیکن لڑکی جب رونے لگی تو میں دوڑ کر اُن تک پہنچا اور اس آدمی سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ وہ باغ علی تھا۔ میں اُسے جانتا تھا۔ اُس کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ میں حیران تو شاداں کو دیکھ کر ہوا۔ اتنی شریف لڑکی اس بدمعاش کے جال میں کس طرح آ گئی تھی؟ ....

"شاداں نے مجھے کہا کہ اس نے مجھے دھوکے سے بلایا ہے اور اس کی نیّت خراب ہو گئی ہے۔ باغ علی نے مجھے بڑے رعب سے کہا کہ جا او تے تو یہاں کیا لینے آیا ہے۔ میرے ہاتھ میں کلہاڑی تھی لیکن میں نے باغ علی کے منہ پر گھونسہ مارا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جو اُس نے مجھے ماری لیکن میں نے لاٹھی کلہاڑی پر روک لی اور اُس کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ لاٹھی پھینک کر اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر آگے کو جھکا۔ میں نے کلہاڑی پھینک دی اور اُسے گھونسے سے مارنا شروع کر دیا۔ وہ گرا تو میں نے اس کے پہلوؤں میں ٹھڈ مارے۔ اُسے اس وقت چھوڑا جب وہ ہلنے یا لڑنے کے قابل نہ رہا....

"میں نے اپنی کلہاڑی اور اُس کی لاٹھی اٹھائی اور شاداں کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ مجھے شک ہوا کہ تھوڑی دُور دو اور آدمی کھڑے تھے۔ معلوم نہیں وہ کون تھے۔ مجھے یہی امید تھی کہ باغ علی اب

میرے پیچھے نہیں آئے گا۔ شاداں روتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ میں ایک جگہ رُک گیا اور اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیا لینے آئی تھی۔ شاداں رو رو کر اپنا بُرا حال کر رہی تھی۔"

مہتاب کا باقی بیان میری زبان سے سُنیں۔ شاداں کے پاس کوئی ٹھوس جواب نہیں تھا کہ وہ باغ علی جیسے آدمی کے پیچھے گھر سے کیوں نکل آئی تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ باغ علی بدمعاش آدمی تھا۔ وہ نو دس سال کی تھی جب اس کا باپ مر گیا تھا۔ اُس کا کوئی بڑا بھائی نہ تھا۔ کوئی چھوٹا بھائی بھی نہیں تھا۔ دو بھائی پیدا ہوتے۔ دونوں مر گئے تھے۔ باپ شاداں کے ساتھ بہت پیار کرتا تھا۔ اُسے اُٹھائے اُٹھائے پھرتا تھا۔ وہ بھی نہ رہا۔ ماں نے اُسے بہت پیار دیا لیکن بچّی باپ کا پیار چاہتی ہے۔ یہ صحیح تھا کہ شاداں شریف لڑکی تھی۔ شرم وحیا والی بھی تھی لیکن انسان کی جو فطرت خدا نے بنائی ہے اس کے تقاضوں سے شاداں آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے باغ علی اچھا لگا تو اُس نے اسی کی محبت کو اپنے دُکھوں کا علاج سمجھ لیا۔ باغ علی کی زبان اور ایکٹنگ نے اُس پر جادو کا اثر کیا۔ ادھر اُسے شک ہوا کہ ماں اسے کسی اپنی پسند کے آدمی کے ساتھ بیاہ رہی ہے۔ اس ڈرامے میں باغ علی کی نوکرانی کی چالاکی بھی شامل تھی۔ ان سب وجوہات نے شاداں کو اندھا کر دیا لیکن اُس کی جو عبادت تھی اور اُس کی ماں کی جو غریب پروری تھی، اس کا خدا نے اُسے یہ صلہ دیا کہ مہتاب پہنچ گیا۔ اس طرح شاداں ذلت سے بچ گئی اور زیور بھی بچ گیا۔

یہ رائے جو میں نے بیان کی ہے، میری ہے۔ نہ شاداں بتا سکتی تھی کہ یہ حرکت اُس سے کیوں ہوئی نہ مہتاب بتا سکتا تھا۔ وہ اتنا ہی سمجھتے تھے کہ فلاں حرکت اچھی ہے اور فلاں بُری۔ شاداں رونے کے سوا کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔ وہ بولی تو اُس نے اتنا ہی کہا کہ

اُسے معلوم نہیں کہ وہ یہ حرکت کیوں کر بیٹھی ہے۔ اُس نے مہتاب کے آگے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ باغ علی کے ساتھ اس کا تعلق ناجائز نہیں تھا۔

یہ تو مہتاب نے دیکھ ہی لیا تھا۔ شاداں نے مہتاب کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا کہ وہ کسی کو نہ بتائے۔ اگر مہتاب اُس پر اپنی نیت خراب کرتا تو کر سکتا تھا۔ شاداں اُس کے ہاتھوں میں مجبور تھی۔ شاداں نے اُسے تفصیل سے سُنا دیا کہ وہ کس طرح باغ علی کے جال میں آ گئی تھی۔ اُس نے باغ علی کی نوکرانی کا بھی ذکر کیا۔

"میں کوئی فرشتہ نہیں ملک صاحب!" ——— مہتاب نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا ——— "لیکن دل میں ایسا ترس آیا کہ میں نے قسم کھائی کہ اس لڑکی کی عزت پر اپنی جان دے دوں گا۔ باغ علی ہماری ذات کا آدمی ہے۔ برادری میں کوئی بھی اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ لیکن زبان کا اتنا میٹھا اور پیارا ہے کہ پتھروں سے بھی دودھ نکال لیتا ہے۔"

مہتاب نے شاداں سے کہا کہ جو کچھ ہُوا اسے ہضم کر جائے اور اپنے گھر چلی جائے۔

"تم میرے ساتھ چلو" ——— شاداں نے مہتاب سے کہا ——— "میری ماں جاگی ہوئی ہوگی اور میرے لیے بہت پریشان ہوگی۔ اسے تم بتانا کیا ہُوا ہے۔ میں اُس کے پاؤں پڑ کر معافی مانگ لوں گی۔"

"دُعا کرو اُس کی آنکھ نہ کھُلی ہو" ——— مہتاب نے کہا ——— "میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ تم اندر چلی جانا۔ اگر تمہاری ماں جاگی ہوئی ہو تو مجھے بلا لینا۔ اگر سوئی ہوئی ہو تو آہستہ سے زیور وہیں رکھ دینا جہاں سے اٹھایا تھا۔ پھر باہر نہ آنا۔ میں تھوڑی دیر انتظار کر کے چلا جاؤں گا۔"

شاداں باہر آ گئی۔ اس نے مہتاب کو بتایا کہ ماں بڑی گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔ وہ دروازہ بند کرنے آئی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر

مہتاب کی منت کی کہ وہ اُس کا پردہ رکھے۔

"تم یہ وعدہ کرو کہ پھر کبھی کسی کی باتوں میں نہیں آؤ گی" ــــ مہتاب نے کہا۔

"تمہارے ساتھ کیا وعدہ کروں گی، یہ تو میں خدا کے ساتھ وعدہ کروں گی" ــــ شاداں نے کہا ــــ "اور خدا سے معافی مانگوں گی۔"

دوسرے دن شاداں مہتاب کے گھر چلی گئی اور اس کی بیوی کے پاس بیٹھی رہی۔ مہتاب نے اس سے پوچھا خوش ہونا شاداں؟ ... شاداں نے ہنس کر کہا کہ وہ بہت خوش ہے۔ اُس نے مہتاب کے ساتھ اسی طرح کی ایک دو اور باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ مہتاب کی بیوی کے ہاں زیادہ جانے لگی۔

شاداں نے ایک دو روز بعد مہتاب کو بتایا کہ نوکرانی باغ علی کا پیغام لے کر آئی تھی۔ مہتاب نے اُسے کہا کہ وہ پھر آئے تو اسے صاف جواب دے دینا۔ یہ عورت پھر بھی آتی رہی اور شاداں ہر بار مہتاب کو بتاتی رہی۔ مہتاب کے ہی کہنے پر شاداں نے اس عورت سے کہا تھا کہ وہ آئندہ نہ آئے۔

ایک روز مہتاب شاداں کے گھر گیا۔ شاداں اسے اکیلی مل گئی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اس نے مہتاب کو بتایا کہ باغ علی نے اُس کی ماں سے اُس کا رشتہ مانگا اور ماں اُس کے ساتھ وعدہ کر آئی ہے۔ ماں نے باغ علی کے گاؤں سے واپس آکر شاداں کو بتایا تھا اور باغ علی کی تعریفیں بھی کی تھیں۔

"باغ علی کے پاس کوئی تعویذ ہے یا کوئی جادو ہے" ــــ شاداں نے مہتاب سے کہا ــــ "جس طرح میں اس کی باتوں میں آگئی تھی اسی طرح میری ماں پر اُس کا جادو سوار ہو گیا ہے۔ کہتی ہے کہ بیچارے کو لوگوں نے خواہ مخواہ بدنام کر رکھا ہے۔ وہ اکیلا ہے اور کسی اچھے

ساتھ کے لیے ترس رہا ہے .... میں نے ماں سے کہا ہے کہ باغ علی کی شہرت اچھی نہیں، سنا ہے وہ شراب بھی پیتا ہے لیکن ماں تو اس کی مرید ہو گئی ہے۔"

مہتاب نے شاداں کو تسلی دی کہ وہ اسے باغ علی سے بچائے گا۔ دو روز بعد شاداں نے مہتاب کو بتایا کہ باغ علی کی نوکرانی آئی تھی اور ماں نے اُس کے رشتے کا وعدہ پکا کر دیا ہے۔ مہتاب نے اُسے کہا کہ اُس کی جان چلی جائے تو بھی وہ پرواہ نہیں کرے گا لیکن یہ رشتہ نہیں ہونے دے گا۔

تیسری بار مہتاب نے باغ علی کی نوکرانی کو شاداں کے گھر جاتے دیکھا لیا اور کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ وہ اُس راستے پر جا کھڑا ہوا جو باغ علی کے گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ اُسے بہت دیر کھڑا رہنا پڑا۔ آخر باغ علی کی نوکرانی آ گئی۔ وہ اپنے گاؤں کو واپس جا رہی تھی۔ مہتاب نے اُس سے پوچھا کہ وہ کس کے گھر گئی تھی۔ اس نے جھوٹ بولا اور کسی اور کا گھر بتایا۔ مہتاب نے اُسے اُسی طرح مارنا پیٹنا شروع کر دیا جس طرح اس عورت نے مجھے اپنے بیان میں سنایا تھا۔ پھر اُسے کہا کہ باغ علی سے کہنا کہ باز آجا۔ یہ رشتہ تجھے نہیں ملے گا۔

لڑکی خوبصورت نہ تھی چہرے پر بھولپن اور معصومیت

وہاں سے مہتاب شاداں کے گھر گیا اور اُس کی ماں کو الگ بٹھا لیا۔ وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُسے شاداں کے رشتے کی بات شاداں نے بتائی ہے۔

"خالہ!" ــــ اُس نے شاداں کی ماں سے کہا ــــ "ابھی ابھی مجھے باغ علی کی نوکرانی ملی ہے۔ وہ تمہارے گھر سے اپنے گاؤں کو جا رہی تھی۔ اُس نے بتایا ہے کہ تم شاداں کا رشتہ باغ علی کو

دے رہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ برادری کا کوئی شخص باغ علی سے منہ نہیں لگاتا اور کوئی گھر اُسے رشتہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ تم اتنی نیک عورت ہو، شاداں بھی تمہاری طرح نیک لڑکی ہے۔ اس کی زندگی تباہ نہ کرو... پھر یہ دیکھو کہ وہ رشتے کے لیے اپنی نوکرانی کو بھیج رہا ہے۔ وہ اپنے خاندان کی عورتوں کو کیوں نہیں بھیجتا؟

شاداں کی ماں نے پھر بھی باغ علی کو اچھا کہا لیکن مہتاب نے اسے باغ علی کی ایسی تصویر پیش کی کہ شاداں کی ماں کا دماغ روشن ہو گیا۔ دو روز بعد شاداں کی ماں باغ علی کے گاؤں گئی۔ باغ علی کو رشتے سے صاف جواب دے دیا۔ واپس آ کر اُس نے مہتاب کو بتایا کہ وہ جواب دے آئی ہے۔

"... لیکن مہتاب!" ـــــ شاداں کی ماں نے کہا ـــــ "باغ علی کو تم پر بہت غصہ ہے۔ میرا جواب سُن کر اُس نے کہا کہ میں جانتا ہوں تمہارا دماغ کس نے خراب کیا ہے۔ مہتاب کو کہنا کہ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھے۔ اس کی زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں ... میں نے وہاں تین چار عورتوں سے پوچھا کہ باغ علی کیسا آدمی ہے۔ سب نے کہا کہ بہت گندا آدمی ہے۔ اس نے بہشتی کی بیوی کو اپنی بیوی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ ایک عورت نے تو یہاں تک کہا کہ باغ علی تو اپنی بہن کی عزت کا سودا کرنے سے بھی نہ ٹلے۔"

"تم اصل جانگلی ہو مہتاب!" ـــ میں نے مہتاب سے کہا ـــ "یہ بات مجھے اُس وقت بتا دیتے جب تم اپنے بھائی کو چارپائی پر ڈال کر تھانے لائے تھے۔ میں اِس وقت تک ملزموں کے اقبالی بیان لے چکا ہوتا۔"

"لیکن مارا تو میرا بھائی گیا ہے" ـــــ مہتاب نے کہا ـــ "باغ علی وار کرتا تو مجھ پر کرتا۔ کل جب آپ ہمارے گاؤں میں اپنی تفتیش کر رہے تھے اُس وقت میں اپنے بھائی کے دوستوں سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ اُس کی ذاتی دشمنی کس کے ساتھ تھی۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ باغ علی مجھ پر وار کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

"باغ علی نہ تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا نہ تمہارے بھائی کو!" ـــ میں نے کہا ـــــ "اُس نے تمہیں فصل کا نقصان دینا تھا۔ اگر تمہارے بھائی کی آنکھ نہ کھلتی تو وہ زندہ رہتا۔ اُسے قتل کرنا چاہتا تو آگ لگانے سے پہلے سوئے ہوتے کو قتل کر دیتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چاندنی راتیں ہیں۔ اُس نے پہلے یہ دیکھا ہو کہ یہاں کون سویا ہوا ہے۔ دیکھا کہ یہ مہتاب نہیں رضا ہے۔ اُس نے رضا پر وار نہ کیا اور اپنا دوسرا کام کر گیا... تم مجھے ذرا سا اشارہ دے دیتے تو میں کل ہی باغ علی کو تھانے بلا لیتا۔"

"معلوم نہیں آپ میری زبان پر یقین کریں گے یا نہیں" ـــ مہتاب نے کہا ـــــ "اب بھی میں یہی کہتا ہوں کہ باغ علی میں اتنا سخت وار کرنے کی ہمت نہیں۔ مجھے یہ سوچ خاموش رہنے پر مجبور کر رہی تھی کہ میں نے باغ علی کے خلاف شک لکھوایا تو شاداں کا نام بھی آئے گا اور اس کی بدنامی ہوگی۔ آپ کو شاید معلوم ہو گیا ہو گا کہ شاداں کے پیچھے میرے گھر میں فساد پیدا ہو گیا ہے۔ شاداں میرے گھر آتی تھی اور میں کبھی کبھی اُس کے گھر چلا جاتا تھا۔ میری بیوی نے مجھ پر شک کرنا شروع کر دیا۔ سیدھی بات تھی کہ میں اپنی بیوی کو بتا دیتا کہ شاداں اب کیوں ہمارے گھر زیادہ آتی ہے اور میں کیوں اُس کے گھر جاتا ہوں میں نے بیوی کی ناراضگی قبول کر لی، شاداں کی بات اُسے نہ بتائی۔ ایک بار بات میرے منہ سے نکل کر ایک عورت کے منہ میں چلی جاتی تو شام سے پہلے پہلے سارے گاؤں میں مشہور ہو جاتی۔"

مجھے اب اُس کی بیوی اور اُس کے آپس کے لڑائی جھگڑے کے ساتھ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ بولتا جا رہا تھا اور میں سوچتا جا رہا تھا۔

اُس کے سالوں کے بیان بھی میرے ذہن میں آ رہے تھے میرا دماغ اب باغ علی پر اٹک گیا تھا۔ مجھے اب یہ تصدیق کرنی تھی کہ باغ علی کا دوستانہ کیا ان دو بدمعاشوں کے ساتھ ہے یا نہیں جن کے نام اُس کی نوکرانی نے لیے تھے۔

مہتاب کا بیان ختم ہو چکا تھا اور وہ بار بار میری منت کر رہا تھا کہ میں شاداں کو شاملِ تفتیش نہ کروں۔ اُس کا بیان بہت لمبا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ رات کے دس بج رہے تھے۔ اُس نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ شاداں نیک اور شریف لڑکی ہے اور اُس کی ماں معزز عورت ہے اور یہ دونوں باغ علی کے فریب میں آ گئی تھیں۔ باغ علی کی نوکرانی مجھے پہلے ہی بہت سی ایسی باتیں بتا چکی تھی جو مہتاب نے بتائی تھیں۔ میں خود محسوس کر رہا تھا کہ اس لڑکی کو شاملِ تفتیش کر لوں، اس کی ماں کو گواہوں میں شامل کرنا ضروری تھا۔ میں نے دماغ پر زور دیا تو مجھے ایک راستہ نظر آ گیا۔ میں نے قتل اور آتش زنی کا باعث پیش کرنا تھا۔ شاداں کی ماں سے اتنا ہی کہلانا کافی تھا کہ وہ باغ علی کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے رہی تھی اور مہتاب نے اُس کا فیصلہ یہ کہہ کر بدل دیا کہ باغ علی بدمعاش آدمی ہے۔

باغ علی کی نوکرانی سے یہ بیان دلانا تھا کہ وہ باغ علی کے رشتے کا پیغام لے کر شاداں کی ماں کے پاس آیا کرتی تھی اور ایک روز مہتاب نے اُسے مارا پیٹا اور کہا کہ آئندہ اس کام کے لیے شاداں کے گھر نہ آئے اور باغ علی کو بتا دے کہ اُسے یہ رشتہ نہیں ملے گا۔ یہ عورت ایسی جرأت نہیں کر سکتی تھی کہ میں اُسے جو بیان بتاتا، وہ اس سے ہٹ کر کوئی اور بیان دے دیتی۔

بہرحال یہ مقدمے کی تفصیلات ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کو دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے جو کارروائی کی وہ آپ کو سناتا ہوں۔ میں نے اے۔ایس۔آئی سے کہا کہ وہ چھ کانسٹیبل ساتھ لے اور

باغ علی کے گاؤں جا کر نمبردار، باغ علی ولد فلاں اور اس کے دو بدمعاش ساتھیوں کو تھانے لے آئے۔

میں نے گھر جا کر وردی اُتاری اور پرائیویٹ کپڑے پہن کر تھانے آیا۔ مہتاب کو ساتھ لیا اور شاداں کے گاؤں چلا گیا۔ مہتاب مجھے شاداں کے گھر تک لے گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ شاداں کی ماں نے دروازہ کھولا۔ اندر جا کر مہتاب نے اُسے بتایا کہ تھانیدار صاحب آئے ہیں۔ وہ کچھ گھبرائی۔ شاداں بھی جاگ کر آ گئی۔ وہ واقعی خوبصورت لڑکی تھی اور اُس کے چہرے پر بھولپن اور معصومیت تھی۔ میں نے مہتاب کو باہر بھیج دیا۔

میں نے شاداں کی ماں کو بتایا کہ وہ گھبرائے نہیں۔ شاداں وہیں بیٹھی رہی۔ میں نے اُس کی ماں سے پوچھا کہ اُس نے اپنی بیٹی کا رشتہ باغ علی کو دینے کا وعدہ کیا تھا؟ اُس نے کہا کہ کیا تھا۔

"پھر اُسے رشتہ دیا کیوں نہیں؟"

"پتہ چل گیا تھا کہ وہ ٹھیک آدمی نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا۔

"کس طرح پتہ چلا تھا؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "اور تمہیں کس نے روکا تھا؟"

"سب سے پہلے مہتاب نے روکا تھا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "پھر میں نے باغ علی کو جواب دے دیا تھا۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ باغ علی کی نوکرانی تاجو اُس کے پیغام لایا کرتی تھی؟"

"ہاں جی!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "وہی آیا کرتی تھی۔"

اس طرح میں اس سے سوال پوچھتا رہا اور مہتاب کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ میں نے اُسے کہا کہ ضرورت پڑی تو اُسے عدالت میں یہ بیان دینا پڑے گا۔

"کیوں جی؟" ــــ اُس نے پوچھا ــــ "باغ علی نے کچھ کیا ہے؟"
"یہ میں تمہیں بتاؤں گا" ــــ میں نے کہا ــــ "ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تمہاری عزّت کا پورا خیال رکھوں گا۔"

لگاتی رہ اب ٹاکیاں

آدھی رات کے بہت بعد اے۔ ایس۔ آئی باغ علی اور اُس کے ایک ساتھی کو لے آیا۔ اُس کے دوسرے دوست کے متعلق پتہ چلا کہ بیمار ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے بتایا کہ وہ اس شخص کے گھر گیا تو اُس کی بیوی نے بتایا کہ وہ بہت بڑی تکلیف میں ہے۔ پیٹ کی کوئی تکلیف ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی اندر چلا گیا اور اُسے دیکھا۔ وہ پیٹ کے بل چارپائی پر لیٹا ہوا ہائے ہائے کر رہا تھا۔ اے ایس آئی نے پوچھا تو اُس نے پیٹ کی تکلیف بتائی۔ اے۔ ایس۔ آئی نے اسے بہانہ سمجھا اور اسے سیدھا ہونے کو کہا۔
"حضور! میں پیٹھ پر لیٹا تو درد سے مر جاؤں گا" ــــ اُس نے کراہتے ہوئے کہا ــــ "پیٹ پر لیٹتا ہوں تو ذرا آرام آتا ہے۔"
اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے بتایا کہ اُس سے ایسی بدبُو آ رہی تھی جیسے گلے سڑے مُردار سے آتی ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی نے اُسے اُٹھنے کو کہا تو وہ اور زیادہ چیخنے لگا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے دو کانسٹیبلوں کو وہیں چھوڑا اور باقی دو کو اور نمبردار کو ساتھ لے کر آ گیا۔
میں نے باغ علی سے پوچھا کہ اُس کے دوست کو کیا تکلیف ہے؟
"وہ میرا دوست کہاں ہے جی!" ــــ باغ علی نے جواب دیا ــــ "نہ میں اُس کی تکلیف کے متعلّق کچھ جانتا ہوں۔"

"تم تو جانتے ہو گے!" ــــ میں نے دس نمبریئے بدمعاش سے پوچھا۔
"کہتا ہے پیٹ میں بڑا سخت درد ہے" ــــ اُس نے جواب دیا۔
"کسی سیانے کا علاج نہیں کرا رہا؟"
"معلوم نہیں حضور!" ــــ اُس نے جواب دیا۔
اس موقع پر میری چھٹی حس نے کام کیا۔ میں نے اے ایس آئی سے کچھ سوال پوچھے اور کچھ تبادلۂ خیال کیا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے کہا کہ وہ کچھ سوچ کر وہاں دو کانسٹیبلوں کو بٹھا آیا ہے۔ مجھے فوری حرکت کی ضرورت نہیں تھی لیکن مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی جیسے بچہ فوراً ایک چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہو۔
اے۔ ایس۔ آئی اپنی گارد کے ساتھ تانگے پر گیا اور آیا تھا۔ تانگہ ابھی تھانے میں ہی تھا۔ میں نے نمبردار، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو اپنے ساتھ تانگے میں بٹھایا اور باغ علی کے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ پگڈنڈی اچھی تھی۔ تانگے نے جلدی پہنچا دیا۔ نمبردار سے کہا کہ مجھے دس نمبریئے سجو کے گھر لے چلے۔
دروازہ سجو کی بیوی نے کھولا۔ میں کچھ کہے بغیر اندر چلا گیا۔ میرے پاس ٹارچ تھی۔ سجو کی بیوی سے کہا کہ لالٹین جلائے اور ہمیں سجو تک لے چلے۔ اُس نے ایک کمرے میں جا کر لالٹین جلائی۔ میں بھی اندر چلا گیا۔ سجو ایک چارپائی پر پیٹ کے بل پڑا تھا۔ اُس نے سر اُٹھا کر کہا ــــ "ملک صاحب سلام علیکم!"
"کیا ہو گیا ہے سجو!" ــــ میں نے کہا ــــ "سنا ہے پیٹ میں درد ہو رہا ہے؟"
"ہاں حضور!" ــــ اُس نے کراہتے ہوئے کہا ــــ "تشریف رکھیں نا، ملک صاحب!"

اُس کے اُوپر کھیس تھا اور سر کپڑے میں لپٹا ہُوا تھا۔ میں نے اُس کے سر سے کپڑا ہٹا دیا۔ سر کا پیچھے والا حصّہ اُوپر تھا۔ اُس کے بال ذرا لمبے تھے۔ میں نے جس امید پر اُس کا سر ننگا کیا تھا وہ پوری ہوگئی۔ میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ سر کے پیچھے بال نہیں تھے۔ یُوں کہیں کہ جلے ہوتے تھے۔ باقی سر کے بال ٹھیک تھے۔

میں نے اُس کے اُوپر سے کھیس اُٹھا کر فرش پر پھینک دیا۔ اُس کی پیٹھ پر ایک کپڑا پڑا ہُوا تھا جو اُس کی گردن سے کولہوں تک تھا۔ بدبُو برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے یہ کپڑا بھی ہٹا دیا۔ اس کے نیچے میں نے جو دیکھا اُس سے مجھے افسوس بھی ہُوا اور خوشی بھی۔ اُس کی پیٹھ ایسی بُری طرح جلی ہوئی تھی کہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ زیادہ تر پیٹھ کا بالائی حصّہ جلا تھا۔ اس کے نیچے جلن ذرا کم تھی۔

"سجو!" ـــــ میں نے نرم سے لہجے میں کہا ـــــ "یار تم تو کہتے تھے کہ پیٹ میں تکلیف ہے .... اب یوں کرو سجو! اپنے جلے ہوئے کپڑے مجھے دے دو" ـــــ نمبردار سے میں نے کہا ـــــ "چار آدمی لے آؤ جو اسی طرح اس کی چارپائی اُٹھا کر تھانے لے چلیں۔ .... ہاں سجو بھائی! جلے ہوئے کپڑے کہاں ہیں؟"

میں اپنی تکلیف سے مر رہا ہوں ملک صاحب حضور!" ـــــ اُس نے کراہتے ہوئے کہا ـــــ "آپ معلوم نہیں کس چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔"

"وہ جو مر گیا ہے وہ بھی کسی ماں کا بیٹا تھا سجو!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "بڑا خوبصورت لڑکا تھا .... میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں سجو! مجھے چکر دو گے تو ہسپتال نہیں لے جاؤں گا۔ تھانے پڑے پڑے مر جاؤ گے۔ میں پرواہ نہیں کروں گا۔"

نمبردار آدمیوں کو لانے چلا گیا تھا۔ اُس کے آنے تک سجو مجھ سے وعدہ لے چکا تھا کہ میں اُسے وعدہ معاف گواہ بناؤں گا۔ یہ وعدہ

تو میں ہر ملزم کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ اُس نے نمبردار اور چار آدمیوں کے سامنے بیوی سے کہا کہ انہیں جلی ہوئی قمیص اور شلوار نکال دے۔

اُس نے اپنی بیوی کو بڑی بُری گالی دے کر کہا ـــــ "اسے کہتا رہا کہ یہ کپڑے جلا دے۔ یہ کہتی تھی کہ شلوار اُوپر سے ذرا جلی ہے، ٹاکی لگ جائے گی اور قمیص آگے سے ٹھیک ہے" ـــــ اُس نے ایک گالی دے کر کہا ـــــ "لگاتی رہ اب ٹاکیاں"۔

میرے پُوچھنے پر اُس نے گاؤں کے ایک ہندو سیانے کا نام بتایا جس نے اس کی پیٹھ پر دوائی لگائی تھی۔ میں نے اُسے بھی بلا لیا اور وہاں جو کاغذات جلے ہوئے کپڑوں کی برآمدگی کے تیار کرنے تھے وہ کیے اور تھانے آگیا۔ سجو کو چارپائی پر لایا گیا تھا۔ سیانا بھی ساتھ تھا۔

اے۔ ایس۔ آئی نے اس گاؤں سے واپس آکر مجھے بتایا تھا کہ سجو چارپائی پر اُلٹا پڑا تھا اور کہتا تھا کہ پیٹ میں درد ہے جسے پیٹ کے بل لیٹنے سے آرام آتا ہے اور اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ سجو سے بدبُو مردار جیسی آتی تھی۔ مجھے یاد آگیا کہ مقتول نے نزعی بیان میں کہا تھا کہ جس آدمی نے فصل کے ڈھیر کو آگ لگائی تھی وہ اس کے دھکے سے آگ میں گرا تھا۔ اُس کی پیٹھ آگ کی طرف تھی۔ اس لیے جو مشتبہ اشخاص میرے سامنے آئے، میں نے اُن سب کے کپڑے اُترواکر جسم دیکھے تھے۔

اے۔ ایس۔ آئی نے اُس کی پیٹھ نہیں دیکھی تھی۔ اُس نے شک کی بناء پر وہاں دو کانسٹیبل بٹھا دیئے تھے۔ میں نے اُسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ شخص سجو جلا ہُوا ہے اور پیٹھ کے بل نہیں لیٹ سکتا۔

نہ وہ کسی کو بتا سکے گی

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی جب باغ علی کو

میں نے اپنے سامنے بٹھایا تھا اور اُسے کہا تھا ــــ "تمہارے دونوں یار آ گئے ہیں۔ اب کہو، بولو گے یا ان میں سے ایک کو وعدہ معاف گواہ بناؤں؟"

اُس کا سر جھک گیا اور زبان کا جادو ختم ہو گیا تھا۔

"مجھے تمہارے بیان کی ضرورت ہی نہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "تمہاری اپنی نوکرانی جسے تم نے بغیر نکاح کے بیوی بنا رکھا تھا میرے قبضے میں ہے۔ وہ بیان دے چکی ہے۔ شاداں کی ماں کا بیان ہو گیا ہے۔ مہتاب کا بیان ہو گیا ہے۔ سجو اپنے جلے ہوئے کپڑے بھی میرے حوالے کر چکا ہے۔"

"وعدہ معاف گواہ بنا لو" ــــ اُس نے کہا ــــ "آپ جو مانگیں گے دُوں گا۔"

"ابھی بیان دے دو" ــــ میں نے کہا ــــ "باقی لین دین بعد میں کریں گے۔"

اُس نے وہی کہانی سنائی جو میں اُس کی نوکرانی سے اور مہتاب سے سن چکا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ شاداں کو خراب کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ کہتی تھی شادی کروں گی، شرعی بیوی بنوں گی۔

باغ علی کو جب یہ موقع ملا کہ شاداں نے گھر سے بھاگنے کا ارادہ کیا تو اُس نے اپنے ان دونوں دوستوں کے ساتھ ذکر کیا۔ دوستوں کو معلوم تھا کہ باغ علی شاداں کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا، کھیلنا چاہتا ہے۔ انہوں نے باغ علی کو تیار کر لیا کہ لڑکی زیور لے کر آ جاتے اور اُسے وہیں خراب کر کے اور اُس سے زیور لے کر آ جائیں گے۔ کسی کو کوئی سراغ نہیں ملے گا نہ وہ اپنی زبان سے کسی کو بتا سکے گی کہ وہ گھر سے زیور اُٹھا لائی تھی۔

باغ علی جب مقررہ رات شاداں کے گاؤں کے قریب طے شدہ جگہ گیا تو یہ دونوں بدمعاش اُس کے ساتھ تھے لیکن ذرا دُور کھڑے تھے۔ باغ علی کو جب مہتاب نے مارا پیٹا تو اُس کے دوست اُس کی

مدد کو نہ آئے۔ انہوں نے اپنے اپنے بیان میں کہا تھا کہ وہ اُس ڈر سے بھاگ آئے تھے کہ باغ علی کی پٹائی کرنے والے دو تین آدمی ہیں جو ماریں گے پھر تھانے لے جائیں گے۔

باغ علی نے گاؤں جا کر اپنے ان دوستوں کو بہت ذلیل کیا تھا۔ جب شاداں نے اس کی نوکرانی کو کہہ دیا کہ وہ آئندہ یہاں نہ آئے تو باغ علی نے یہ طریقہ سوچا کہ شاداں کی ماں سے اُس کا رشتہ مانگ لے۔ وہ مہتاب کے مُنہ پر ہاتھ پھیرنا چاہتا تھا۔ پھر مہتاب نے اُس کی نوکرانی کو مارا پیٹا اور پھر اُس نے شاداں کی ماں سے رشتے سے انکار کروا دیا تو باغ علی نے اپنے دوستوں سے کہا کہ مہتاب سے بدلہ لینا ہے۔ اب باغ علی کو شاداں کے ساتھ اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی مہتاب سے بدلہ لینے کے ساتھ۔

اُس نے اپنے دونوں بدمعاش دوستوں کے ساتھ بدلہ لینے کے طریقوں پر سوچنا شروع کر دیا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ مہتاب رات کو کھلیان میں سوتا ہے۔ تینوں نے فیصلہ کیا کہ مہتاب کو کھلیان میں قتل کیا جائے۔ باغ علی نے کہا کہ قتل کیا جائے اور ساتھ ہی اُس کا کھلیان بھی جلا دیا جائے۔ دوستوں نے کہا کہ تینوں چلیں گے، یعنی باغ علی بھی ساتھ ہو گا۔

تینوں واردات کی رات مہتاب کے گاؤں کے باہر کھیتوں میں چلے گئے۔ باغ علی کا ارادہ تھا کہ پہلے مہتاب کو قتل کریں گے پھر آگ لگائیں گے لیکن باغ علی نے چاندنی میں دیکھا کہ یہ مہتاب نہیں، اس کا بھائی رضا سویا ہوا تھا۔ باغ علی نے کہا کہ اسے قتل نہیں کرنا، اب کھلیان کو جلانا اور یہاں سے بھاگنا ہے۔

سجو نے ڈھیر کو آگ لگائی اور رضا کی آنکھ کھل گئی۔ ڈھیر خشک تھا۔ سجو کے پاس مٹی کے تیل میں بھیگا ہوا کپڑا تھا جو اُس نے ڈھیر کے اندر رکھا اور آگ لگائی۔ آگ فوراً بھڑک اٹھی۔ اُس کی آواز

بجلی تھی اور شعلے کی روشنی بھی۔ سجو پیچھے ہٹ آیا تھا۔ رضا دوڑ کر اُسے پکڑنے لگا تو سجو گھوما اور رضا کے دھکے سے آگ میں اس طرح گرا کہ اس کی پیٹھ آگ کی طرف تھی۔ اُٹھتے اُٹھتے اُس کے کپڑوں کو آگ لگی اور اُس نے شور مچایا کہ اس نے مجھے جلا دیا ہے۔

باغ علی اور دوسرا بدمعاش دوسرے دونوں ڈھیروں کو آگ لگانے لگے تھے، سجو کی آواز پر وہ ادھر کو دوڑے اور انہوں نے لاٹھیاں مار کر رضا کو گرا دیا۔ انہوں نے سجو کے کپڑوں پر مٹی ڈال کر آگ بجھائی اور بھاگ اُٹھے۔

قاتل باغ علی اور اس کا ایک ساتھی تھا۔ میں نے عدالت میں ثابت کرا دیا۔ دونوں کو سزائے موت اور سجو کو عمر قید دی گئی۔



مسیحا کی موت

دِلّی کے ایک تھانے میں چند مہینے ہی ایس ایچ او رہا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان چند مہینوں میں چار پانچ سنگین وارداتیں ہو گئیں۔ جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی اور دِلّی کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ آج کل شہروں میں دن رات قتل کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر چاقو چل جاتے ہیں۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت دِلّی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں چوری وغیرہ کی وارداتیں تو ہوتی رہتی تھیں لیکن قتل کی واردات شاذو نادر ہی ہوتی تھی۔ جنگِ عظیم کے پہلے سال میں ہی ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے لوگوں کے انداز بدل ڈالے اور معاشرتی اقدار کو لوگوں نے روپے پیسے پر قربان کرنا شروع کر دیا تھا۔

میں اپنی بعض کہانیوں میں یہ حالات اور وہ تبدیلی بھی جو اکثر لوگوں کی ذہنیت اور اخلاق میں آ گئی تھی، تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔

ٹھیکیداریوں اور روپے پیسے کی ریل پیل کی وجہ سے جرائم کا رجحان اس سوسائٹی میں بھی پیدا ہو گیا جسے ہم WHITE COLLAR SOCIETY کہتے ہیں۔ یہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہنے والے دولتمند لوگ تھے جن میں اعلیٰ سرکاری افسر بھی شامل تھے۔ میں جس واردات کی تفتیشی کہانی سنانے لگا ہوں، یہ اسی سوسائٹی کی ایک واردات ہے۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے ایک کانسٹیبل نے مجھے گھر آ کر جگایا اور بتایا کہ فلاں علاقے میں ایک مسلمان ڈاکٹر قتل ہو گیا ہے اور اُس کی بیوی نے ٹیلیفون سے اطلاع دی ہے۔ یہ بڑے اچھے مکانوں اور کوٹھیوں کا

علاقہ تھا۔ وہاں امیر کبیر، اچھے رُتبوں اور بہتر حیثیت والے لوگ رہتے تھے۔

تھانے جاکر میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور تین کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور سائیکلوں پر جائے واردات پر پہنچے۔ یہ کوٹھی کی طرز کا چھوٹا سا مکان تھا۔ اس کا گیٹ تھا۔ مختصر سالان تھا اور آگے برآمدہ تھا۔ برآمدے میں دو آدمی کھڑے تھے۔ وہ سلیپنگ سوٹ اور گاؤن پہنے ہوئے تھے۔ میں برآمدے میں پہنچا تو اندر سے ایک بڑی خوبصورت عورت نکلی۔ اُس کی عمر پچیس سال سے کچھ کم ہی تھی، زیادہ نہیں ہوگی۔ میں نے اُس میں ایک بات فوراً نوٹ کرلی کہ اُس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے ان سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سوئی نہیں تھی بلکہ کہیں سے آئی تھی یا کہیں جارہی تھی۔ بڑے قیمتی کپڑے تھے۔ اُس نے بڑا شوخ میک اَپ کر رکھا تھا اور اُس کے پاؤں میں گھر میں پہننے والی چپل نہیں، اُونچی ایڑی والی سینڈل تھی۔

اُس نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ مقتول ڈاکٹر کی بیوی تھی۔ دو آدمی جو وہاں کھڑے تھے، ساتھ والی کوٹھیوں میں رہتے تھے۔ انہیں مقتول کی بیوی نے جسے میں اصلی نام کی بجائے آصفہ کہوں گا، جگایا اور اِن میں سے ایک کے گھر سے تھانے فون کیا تھا۔ وہ مجھے اندر لے گئے۔

ڈاکٹر مقتول (اصلی نام کی بجائے راحت بیگ) کی لاش ڈرائنگ روم میں فرش پر پڑی تھی۔ فرش پر دری یا قالین نہیں تھا۔ فرش سفید ٹائیلوں کا تھا۔ فرش پر خون اِدھر اُدھر بہہ کر جم گیا تھا۔ لاش ایک پہلو پر پڑی تھی۔ میں نے نظری معائنے کے لیے لاش کو سیدھا کیا۔ سر پر دو زخم تھے۔ سینے پر تیز دھار آلے کے تین زخم تھے۔ ایک گہرا زخم دائیں گال پر اور ایک لمبوترا زخم ایک بازو پر تھا۔

میں نے سب کو پیچھے رہنے کو کہہ دیا تھا۔ لاش کے اردگرد ولائتی شراب کی بوتل کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ بوتل کا پیندا پورا الگ اور بوتل کا اُوپر والا حصّہ الگ پڑا تھا۔ اس حصّے میں بوتل کی گردن تھی اور

بدن کا اس سے نیچے والا کچھ حصّہ اس کے ساتھ اس طرح رہ گیا تھا کہ اس کا ایک حصّہ خنجر کی طرح لمبا اور نوکدار اور دو حصّے اس سے تقریباً نصف لمبے اور نوکدار تھے۔ ایسے ہی اُبھرے ہوئے ٹکڑے پیندے کے ساتھ بھی تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ بوتل درمیان سے ٹوٹی تھی۔

میں نے اپنے تجربے کے مطابق دیکھا۔ میرا قیاس یہ تھا کہ مقتول کے سر پر بوتل سے ضربیں لگائی گئی ہیں۔ سر پر دو زخموں کے علاوہ دو چوٹیں بھی تھیں۔ وہاں سوجن کا اُبھار تھا۔ بوتل ٹوٹ گئی ہوگی۔ اُوپر والا حصّہ قاتل کے ہاتھ میں رہا۔ اُس نے دیکھا کہ یہ حصّہ تین شاخہ خنجر بن گیا ہے تو اُس نے یہ خنجر کی طرح مقتول کو نوک کی طرف سے مارا۔ دائیں گال پر ایک ہی زخم تھا۔ میں نے سینے کے زخم مقتول کی قمیص ہٹا کر ایک بار پھر دیکھے۔ ان میں ایک گہرا تھا اور دوسرے صرف کھال میں ہی اُترے تھے۔ میں نے بوتل کا اُوپر والا حصّہ جسے آپ گردن اور کندھے کہہ سکتے ہیں، ان زخموں پر رکھا۔ اس کے نوکدار حصّے اس طرح زخموں پر فٹ آگئے کہ لمبا خنجر نما ٹکڑا سینے میں گہرا اُتر گیا اور باقی دو حصّوں کی نوکیں صرف کھال میں اُتریں۔ اس سے مجھے یقین سا ہونے لگا کہ آلۂ قتل شراب کی یہ بوتل ہے۔

میں نے بوتل کے اُس ٹکڑے کو گردن سے نہیں پکڑا تھا بلکہ اس کے منہ میں اُنگلی ڈال کر پھنسا لی اور مقتول کے سینے پر رکھا تھا۔ اس احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ بوتل کی لمبوتری گردن پر قاتل کی اُنگلیوں کے نشان تھے۔ یہ نشان ننگی آنکھ سے نظر نہیں آیا کرتے۔ یہ "فنگر پرنٹ بیورو" میں دیکھ کر خاص قسم کے کاغذ پر اُتار لیے جاتے ہیں۔

اُنگلیوں کے نشانات کے لیے مجھے دو چیزیں اور نظر آئیں۔ یہ دو گلاس تھے جو صوفے کے سامنے پڑی ہوئی تپائی پر رکھے تھے۔ ایک میں کوئی دو گھونٹ اور دوسرے میں چند قطرے شراب باقی تھی۔ ایک پلیٹ میں بچے ہوئے تین چار کباب اور تین چار تکّے تھے۔ یہ ثبوت تھا کہ مقتول شراب پیتا تھا اور شراب پینے والے دو آدمی تھے۔ میں نے

دونوں گلاس کناروں سے پکڑ کر الگ کر لیے۔ ان میں سے شراب گرا دی۔ گلاسوں پر بھی انگلیوں کے نشانات کی موجودگی لازمی تھی۔

فرش پر پڑی ہوئی ایک چیز اور مل گئی جو اُن وارداتوں کی جگہوں پر اکثر ملا کرتی ہے جن وارداتوں میں عورت مجرم یا مظلوم کی حیثیت سے موجود ہوتی ہے۔ یہ تھے چوڑیوں کے ٹکڑے۔ دو تین ٹکڑے خون میں پڑے تھے اور باقی خون سے باہر تھے۔ میں نے یہ اکٹھے کر لیے۔

اپنے خاوند کے قتل کا افسوس نہ تھا

میں لاش کے اردگرد اور کمرے میں کوئی اور سُراغ تلاش کرنے لگا۔ آصفہ اور اس کے پڑوسی دروازے میں کھڑے تھے۔

"ساتھ والے کمرے میں ٹیلیفون دیکھیں" — آصفہ نے کہا — "اس کی تار نکلی ہوئی ہے اور فون فرش پر پڑا ہے"۔

میں ساتھ والے کمرے میں گیا۔ یہ دفتر کی قسم کا کمرہ تھا۔ ریکوں میں کتابیں پڑی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ میز تھی اور کمرے میں چار پانچ کرسیاں تھیں۔ میز کے قریب فرش پر ٹیلیفون کا ریسیور پڑا تھا۔ ٹیلیفون سیٹ ریسیور سے ذرا ہٹ کر فرش پر گرا ہوا تھا۔ ریسیور کے ساتھ تار تھی جو سیٹ میں سے نکلی ہوئی تھی۔

میرے سامنے سوال یہ آیا کہ قاتل یا قاتلوں نے اگر ٹیلیفون اس لیے کاٹا تھا کہ اس گھر والے واردات کے دوران پولیس یا کسی اور کو مدد کے لیے نہ بلا سکیں تو ریسیور اور سیٹ کی تار الگ کر دیتے جس طرح کی ہوئی تھی، سیٹ اور ریسیور کو فرش پر پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ میں نے سیٹ اور ریسیور کو احتیاط سے اٹھا کر الگ رکھ لیا۔ ان پر بھی انگلیوں کے نشان لازمی تھے۔

لاش کو پوسٹمارٹم کے لیے بھجوانے کا انتظام کیا۔ مقتول کے دونوں پڑوسیوں سے کہا کہ وہ برآمدے میں بیٹھیں۔ میں نے مقتول کی بیوی سے کہا کہ وہ اپنے گھر کو اچھی طرح دیکھ کر بتائے کہ چوری تو نہیں ہوئی۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں اُس کے ساتھ رہوں کیونکہ وہ دوسرے کمروں میں اکیلے جاتے ڈرتی تھی۔ میں اُس کے ساتھ رہا۔ اُس نے ایک کمرے میں جا کر دو اٹیچی کیس کھولے اور ایک میں جو کپڑے تھے ان کے نیچے سے زیورات کے ڈبے نکالے۔ کچھ زیور اُس نے پہنا ہوا تھا۔ باقی زیورات ڈبوں میں موجود تھے۔

آصفہ نے سارا گھر اچھی طرح دیکھ لیا۔ کاغذات بھی دیکھے اور یقین سے مجھے بتایا کہ کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ قتل چوری کی نیت سے نہیں ہوا۔ پھر قتل کا باعث کیا تھا؟ —— باعث وہ عورت تھی جس کی چوڑیوں کے ٹکڑے جائے واردات سے ملے تھے۔ مجھے اس عورت کا سراغ لگانا تھا۔ آصفہ جب مجھے اپنے ساتھ لیے کمروں میں گئی تھی تو میں نے اُس کی چوڑیاں دیکھی تھیں اور اُس کی نظر بچا کر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے بڑے ٹکڑے دیکھے تھے۔ یہ اُن قسم کی چوڑیوں کے تھے جو آصفہ کے ایک بازو پر تھیں۔ اُن کی تعداد چار تھی۔ اُس کے دوسرے بازو میں گھڑی تھی جس کی چین سونے کی تھی۔

آصفہ نے جو کاغذات دیکھے تھے وہ میں نے بھی دیکھے۔ ان میں مقتول کی انشورنس پالیسی تھی۔ یہ میں نے اُس کے ہاتھ سے لے کر اچھی طرح دیکھی۔ یہ چالیس ہزار روپے کی لائف انشورنس تھی۔ میں نے یہ کاغذات دیکھ کر آصفہ کو واپس کر دیئے تھے۔

اس قسم کی واردات کے بہت سے کاغذات تیار کرنے ہوتے ہیں۔ علاقہ ڈی۔ ایس۔ پی اور علاقہ مجسٹریٹ کو بھی نقول بھیجنی ہوتی ہیں۔ میں نے اس کام کے لیے اے۔ ایس۔ آئی اور محرر ہیڈ کانسٹیبل کو بلا لیا تھا۔ میں خود ان دفتری اور کاغذی کارروائیوں میں وقت ضائع نہیں

کرنا چاہتا تھا۔ میں نے برآمدے میں میز کرسی رکھوا کر تفتیش شروع کر دی۔ بسم اللہ آصفہ سے کی۔

مقتول کے متعلق یہ ذہن میں رکھیں کہ اُس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُس کا جسم مضبوط اور قد چھ فٹ سے ڈیڑھ دو اِنچ کم ہوگا۔ خوبرو آدمی تھا۔ آصفہ نے بتایا کہ اُن کی شادی ہوئے ساڑھے تین سال گزر گئے ہیں۔

"شام کا کھانا کھا کر میں ایک شادی پر چلی گئی تھی" — آصفہ نے میرے پوچھنے پر بتایا — "آج رات مہندی تھی ۔ ۔ ۔ میں نو بجے سے پہلے چلی گئی تھی"۔

"ڈاکٹر صاحب مدعو نہیں تھے؟" — میں نے پوچھا — "وہ کیوں نہیں گئے تھے؟"

"میرے ساتھ یہ کم ہی باہر نکلا کرتا تھا" — اُس نے ایسے لہجے میں کہا جس سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے مقتول کے ساتھ کوئی گہرا لگاؤ نہیں تھا۔ کہنے لگی — "اس نے اپنے کیے کی سزا پالی ہے لیکن میری زندگی تباہ کر دی ہے" — اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

اُس کے آنسو تو بہہ نکلے لیکن ایسے لگتا تھا جیسے یہ آنسو خاوند کے غم کے نہیں۔ اُس وقت تک مجھے آنسو اور مسکراہٹیں سمجھنے کا بہت تجربہ ہو چکا تھا۔ بہرحال یہ خوبصورت امیرزادی اپنے خاوند کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ مجھے کچھ ایسے محسوس ہونے لگا تھا کہ قتل کا باعث یہی عورت ہے لیکن میرے پاس اُس کے خلاف ابھی چوڑیوں کے صرف ٹکڑے تھے جو صرف شک پیدا کرتے تھے۔ اِس عورت کے ساتھ مجھے احتیاط سے کام لینا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ آپ کی زندگی اچھی نہیں گزری" — میں نے کہا اور پوچھا — "آپ نے یہ کیوں کہا ہے کہ اُس نے اپنے کیے کی سزا پالی ہے؟ ڈاکٹر صاحب کیا کرتے تھے؟"

"مسلمان ہو کر یہ شخص شراب پیتا تھا" — اُس نے کہا — "عورتوں کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ اُس کے کلینک میں عورتیں بھی آتی تھیں۔ اُسے جو اچھی لگتی تھی اُسے اپنے پاس بٹھائے رکھتا تھا۔ آج رات یہ اسی لیے میرے ساتھ نہیں گیا تھا کہ اس نے کسی عورت سے ملاقات کرنی ہوگی۔ وہ عورت آئی ہوگی اور اُس کے پیچھے پیچھے اُس کا خاوند آگیا ہوگا۔ وہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کو قتل کر کے اپنی بیوی کو لے گیا!"

"آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کون سی عورت ہے جس کے ساتھ آپ کے خاوند کی دوستی ہوگی"۔

"میں کسی ایک عورت کا نام نہیں بتا سکتی" — آصفہ نے جواب دیا۔

"کیا آپ کا خاوند آپ کا رشتہ دار تھا یا برادری کا تھا؟"

"نہیں صاحب!" — اُس نے جواب دیا — "ہماری برادری تو نوابوں کی برادری ہے۔ یہ تو میرے والد صاحب کی غلطی تھی کہ اُنہوں نے میرے لیے اس شخص کو پسند کر لیا تھا۔ یہ پنجاب کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس نے خود مجھے سنایا تھا کہ یہ کسانوں کے گھر کا لڑکا تھا۔ اس کا باپ اسے دس جماعتیں پڑھانے کی بھی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے محنت مزدوری کر کے اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کیے تھے اور اِدھر اُدھر نوکریاں کر کے ایف۔ ایس۔ سی کیا اور اسی طرح اس نے فاقے کر کے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر لیا، پھر اس نے تین سال کسی سرکاری ہسپتال میں ملازمت کی پھر اپنا کلینک کھول لیا۔ یہ محنت کا عادی تھا اس لیے اس نے مریضوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔ جب سے جنگ شروع ہوئی ہے، اسے پارٹ ٹائم نوکری بھی مل گئی تھی۔ ہر روز صرف تین گھنٹے فوج کے بھرتی دفتر میں جاتا تھا۔ بھرتی عام ہو گئی ہے جنہیں فوج میں لے لیا جاتا تھا یہ اُن کا ڈاکٹری معائنہ کرتا تھا"۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول بڑی سخت جدوجہد کر کے اس حیثیت تک پہنچا تھا" ـــــ میں نے کہا ـــــ "ایسے آدمی تو قابلِ قدر ہوتے ہیں۔"

"مگر یہ شخص تنگ نظر تھا" ـــــ آصفہ نے کہا ـــــ "یہ دیہات میں پل کر جوان ہوا، اور اس نے غربت میں جدوجہد کی ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ امیروں اور اونچی حیثیت کے لوگوں کی سوسائٹی میں کس طرح اٹھا بیٹھا جاتا ہے۔ اس کے پاس پیسہ آیا تو یہ غلط راستے پر چل پڑا۔"

"کیا یہ آپ پر سختی کرتا تھا؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "کیا اس نے آپ پر پابندیاں عائد کر رکھی تھیں؟"

"کچھ ایسی ہی بات تھی" ـــــ اس نے جواب دیا۔

اس کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔ ضروری نہیں کہ آپ کو وہ ساری باتیں سنائی جائیں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آصفہ نے مجھ پر یہ تاثر پیدا کیا کہ اسے اپنے خاوند کے قتل پر اگر خوشی نہیں تو اتنا افسوس بھی نہیں جتنا کسی عورت کو بیوہ ہو جانے پر ہونا چاہیے۔ اس سے مجھے یہ شک ہونے لگا کہ اس نے اپنے خاوند کو خود قتل نہ کرا دیا ہو۔

میں فوری طور پر اس پر اس شک کی بناء پر حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ادھر ادھر سے مزید معلومات لینا ضروری تھا۔

آصفہ سے میں نے نوکروں کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ گھر میں ایک نوکرانی کام کرتی ہے جو رات کو اپنے گھر میں سوتی ہے۔ کلینک میں ایک ڈسپنسر تھا اور ایک نوکر۔ میں نے ان تینوں کے نام اور ایڈریس معلوم کر لیے اور ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ پہلے گھر کی نوکرانی کو لے آئے۔ پھر ڈسپنسر اور نوکر کو یہاں لائے۔

ہر وقت میک اپ کیے رکھتی تھی

میں نے دو پڑوسیوں کو روک رکھا تھا۔ میں نے دونوں سے معذرت کی کہ میں انہیں پریشان کر رہا ہوں لیکن مجرموں کو پکڑنے کے لیے شہریوں کا تعاون ضروری ہوتا ہے۔ دونوں حکومت کے افسر تھے۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ میں نے دونوں سے الگ الگ مقتول اور آصفہ کے متعلق اور ان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں پوچھا۔ دونوں کی رائے تقریباً ایک جیسی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ میاں بیوی میں اکثر لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ ان دونوں کو ان کی بیویوں نے بتایا تھا کہ مقتول اور آصفہ میں کبھی کبھی ہاتھا پائی بھی ہو جاتی تھی۔

آصفہ کے متعلق انہوں نے بتایا کہ اس کے چال چلن کے متعلق وہ کوئی رائے نہیں دے سکتے، لیکن یہ مغرور سی عورت ہے۔ ہر وقت میک اپ کیے رکھتی ہے اور کھوکھلی سی عورت تھی۔ ان دونوں کی بیویوں کو اور ساتھ والی دوسری کوٹھیوں کی عورتوں کو آصفہ بتاتی رہتی تھی کہ اس کا خاوند عیاش اور بدکار آدمی ہے اور وہ آصفہ میں دلچسپی نہیں لیتا۔

مقتول کے متعلق انہوں نے بتایا کہ ملنسار اور ہنس مکھ آدمی تھا۔ اس کی پریکٹس اسی لیے اچھی چل رہی تھی کہ مریضوں سے ہمدردی اور محبت سے بولتا تھا۔ کوئی غریب آدمی بھی اس کے گھر آدھی رات کو آ جاتا تو یہ اس کے گھر جا کر مریض کو دیکھتا تھا۔ کسی غریب آدمی سے اس کے گھر جانے کی فیس نہیں لیتا تھا۔

مجھے پتہ چلا کہ ساتھ والی کوٹھیوں کی عورتیں بھی جاگ رہی ہیں۔ ان کے پڑوس میں قتل کی واردات ہو گئی تھی۔ وہ سو کیسے سکتی تھیں؟ میں نے ان دونوں آدمیوں سے کہا کہ وہ اپنی بیویوں کو بلا دیں۔ وہ اسی وقت گئے اور اپنی بیویوں کو ساتھ لے آئے۔ دونوں پڑھی لکھی اور شائستہ عورتیں

تھیں۔ ان دونوں سے بھی میں نے الگ الگ رائے لی۔ دونوں کی رائے ایک جیسی تھی۔

ان دونوں سے مجھے معلوم ہوا کہ آصفہ جھگڑالو تھی۔ اپنے خاوند کے خلاف کبھی رو کر کبھی غصے میں باتیں سناتی رہتی تھی۔ اس میں غصہ زیادہ تھا۔ یہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی سڑیل تھی۔ ان عورتوں نے یہ بھی بتایا کہ مقتول خوش رہنے اور خوش رکھنے والا آدمی تھا اپنی بیوی کے ساتھ جب اس کی لڑائی ہوتی تھی تو آواز بیوی کی ہی آتی تھی، ڈاکٹر کی آواز کبھی نہیں سنی تھی۔

میں نے دونوں عورتوں سے ایک سوال پوچھا تھا ——— "کیا آصفہ نے کبھی ایسی بات کی تھی کہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی اور اس کی شادی اس ڈاکٹر کے ساتھ کر دی گئی؟"

"ہاں!" ——— دونوں کا جواب تقریباً ایک جیسا تھا ——— "آصفہ نے کئی بار کہا تھا کہ ماں باپ مجھے اجازت دیتے تو میں ایسے آدمی کو ان کا داماد بناتی جس پر وہ فخر کرتے ..... آصفہ کسی آدمی کو چاہتی ضرور تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے۔"

آصفہ کے ماں باپ دلی میں ہی رہتے تھے۔ ان کا گھر بہت دور تھا۔ آصفہ نے ان کو اطلاع بھیج دی تھی۔ میں جب ان عورتوں سے پوچھ گچھ کر رہا تھا تو آصفہ کی ماں، اس کا باپ اور دو بھائی آ گئے۔ میں نے انہیں کوٹھی کے کسی کمرے میں جانے کی اجازت نہ دی۔ وہ آصفہ کے ساتھ باہر لان میں رونے بیٹھ گئے۔

جب ان عورتوں کو میں نے فارغ کیا تو کانسٹیبل نوکرانی کو لے کر آ گیا اور ڈسپنسر اور کلینک کے نوکر کو لانے کے لیے چلا گیا۔ میں نے نوکرانی کو یہ کہہ کر الگ بٹھا دیا کہ کسی کے ساتھ بات نہ کرے۔ آصفہ کا باپ میرے پاس آ گیا۔ اس نے میرے ساتھ ایسے انداز اور لہجے میں بولنا شروع کر دیا جیسے وہ کسی ریاست کا نواب ہو۔ وہ مجھے حکم دے رہا تھا۔ یہ شخص ہندوستان کی ایک خاص کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ انگریزوں نے جب ہندوستان

میں اپنی حکومت مستحکم کر لی تھی، اس وقت ہندوستان میں بہت سی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں جن کے حکمران نواب تھے۔ انگریزوں نے چند ایک بڑی ریاستوں کو قائم رہنے دیا اور باقی نوابوں کے سالانہ وظیفے یا پنشن مقرر کر دی۔ انگریزی بڑی چالاک قوم تھی۔ انہوں نے نوابوں سے کہا کہ وہ چند سالوں کی پنشن اکٹھی لے لیں تو یہ چند سال گزرنے کے بعد ان کی پنشن آدھی ہو جائے گی۔ یہ نواب عیاش لوگ تھے۔ انگریزوں کے جھانسے میں آ گئے۔ پنشن اکٹھی لے کر عیش و عشرت میں اڑا دی۔

میعاد گزر جانے کے بعد انگریزوں نے کہا کہ ایک بار پھر پنشن اکٹھی لے لو اور میعاد گزر جانے کے بعد پنشن ایک چوتھائی ملا کرے گی۔ اس طرح یہ نواب اس مقام پر پہنچ گئے جہاں انہیں چند روپے پنشن ملنے لگی۔ یہ خاندانی الاؤنس تھا۔ نوابوں کی اولاد کو تانگہ چلاتے دیکھا گیا مگر وہ اپنے آپ کو نواب کہلاتے تھے۔

آصفہ کا باپ بھی نواب کہلاتا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کسی ریاست کے والی تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے خاندان کی کچھ جائیداد محفوظ رہ گئی تھی۔ اب اس کے دو بیٹوں نے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ ان لوگوں کی مالی پوزیشن اچھی تھی لیکن آصفہ کے باپ اور اس کی ماں کا دماغ اچھا نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو نواب اور غالباً والئ دلی سمجھتے تھے۔

"نواب صاحب!" ——— میں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر کہا ——— "میں یہاں ایک الٹی بات دیکھ رہا ہوں۔ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے اور اس کی بیوی اور سسر اس کے غم میں نڈھال ہونے کی بجائے مقتول کے خلاف اس طرح باتیں کر رہے ہیں جیسے قتل کرنا نہیں بلکہ قتل ہونا جرم ہے۔ کیا آپ اپنے اس رویے کو واضح کر سکتے ہیں؟ ..... جواب دینے سے پہلے ذہن میں یہ رکھ لیں کہ میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ میں آپ کے حکم کا

پابند نہیں۔ میں قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ ٹھنڈے مزاج سے بات کریں۔"

"مجھے اس کے قتل ہو جانے کا بہت افسوس ہے" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "لیکن میرے دل میں ایک افسوس اور بھی ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست کے کہنے پر اپنی بیٹی کی شادی اس ڈاکٹر کے ساتھ کر دی تھی۔ میں آپ کو صحیح بات بتا دیتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر میں یہ خوبی دیکھی تھی کہ غریب گھرانے سے ابھرا ہے اور اپنا مستقبل بنا رہا ہے۔ میں نے اور میری بیوی نے سوچا کہ اکیلا آدمی ہے۔ اس کے ماں باپ گاؤں میں رہتے ہیں اور وہ وہیں رہیں گے۔ ہماری بیٹی کے سر پر آ کر نہیں بیٹھ جائیں گے۔"

اُس نے بڑی لمبی وضاحت پیش کی تھی جس کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس میں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس شخص نے ڈاکٹر راحت بیگ مقتول کو صرف اس لیے اپنی بیٹی دی تھی کہ وہ اکیلا تھا اور کامیاب ڈاکٹر تھا۔ یہ لوگ اسے "گھر جوائی" بنا کر اس کی آمدنی اپنے قبضے میں لینا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر ان کے جال میں نہ آیا۔ ڈاکٹر اپنی آزادانہ زندگی گزار رہا تھا۔

"نواب صاحب!" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "آپ کا داماد اچھا تھا یا برا، وہ قتل ہو گیا ہے۔ میں قاتل کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ قاتل آپ کی بیٹی کا بھی دشمن ہو۔ اگر وہ جلدی نہ پکڑا گیا تو آپ کی بیٹی کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ان کا دشمن کون تھا؟"

"دشمن میرے داماد کا ہو سکتا ہے" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔ "میری بیٹی کا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا۔"

"آپ کے داماد کا کوئی دشمن کیوں تھا؟"

"بدکار آدمی تھا" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "میری بیٹی مجھے بتاتی رہتی تھی کہ اس کے پاس مریض عورتیں آتی رہتی ہیں اور اسے جو پسند آتی ہے، اُس کے ساتھ یارانہ لگا لیتا ہے۔ میرا خیال ہے ایسی کسی عورت کے خاوند نے ڈاکٹر کو قتل کیا ہے۔"

"اگر آپ مجھے ایسی صرف ایک عورت کا نام بتا دیں تو میں اُسے شامل تفتیش کر لوں گا" ۔۔۔ میں نے کہا۔

"یہ آپ معلوم کریں" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "سراغ لگانا آپ کا کام ہے۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میرا داماد کیسا آدمی تھا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ میری بیٹی نواب خاندان کی لڑکی ہے۔ ہمارے باپ دادا نے حکومت کی ہے۔ اب بھی ہمارا حکم چلتا ہے۔ اب بھی انگریز مجھے سلام کرتے ہیں مگر اس ڈاکٹر نے میری بیٹی کو نوکرانی بنا رکھا تھا..... ذرا اس پر غور کریں۔ رات ہمارے قریبی رشتہ داروں کی مہندی کی رسم تھی۔ انہوں نے راحت بیگ (مقتول) اور میری بیٹی کو خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ میں میری بیوی اور میرے بیٹے بھی مدعو تھے۔ ہم گئے تو انہوں نے کہا کہ راحت اور آصفہ نہیں آئے۔ میں نے کہا کہ آ جائیں گے لیکن راحت بھی نہ آیا اور اُس نے میری بیٹی کو بھی نہ آنے دیا۔"

"کیا آپ کی بیٹی بھی وہاں نہیں گئی تھی؟" ۔۔۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا ۔۔۔ "شاید آپ وہاں سے جلدی چلے گئے ہوں گے اور یہ میاں بیوی آپ کے بعد گئے ہوں گے۔"

"ہم ساڑھے بارہ بجے وہاں سے رخصت ہو گئے تھے" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "اُس وقت تک نہ آصفہ وہاں پہنچی نہ راحت۔ میں نے جان لیا کہ راحت نے میری بیٹی کو نہیں آنے دیا۔"

میں اس لیے حیران ہوا تھا کہ آصفہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں مہندی کی رسم پر گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو اس نے اپنے خاوند کی لاش دیکھی لیکن اُس کا باپ کہہ رہا تھا کہ آصفہ مہندی کی

رسم پر گئی ہی نہیں تھی ۔ یہ تو میں نے دیکھا ہی تھا کہ آصفہ نے کسی تقریب
کے لیے کپڑے پہن رکھے تھے اور اُس نے گہرا میک اَپ کر رکھا تھا۔ اس
کا مطلب یہ تھا کہ وہ مقتول کو یہ بتا کر کہ وہ مہندی کی رسم پر جا رہی ہے کہیں
اور چلی گئی، اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کہیں بھی نہیں گئی اور اُس نے خود خاوند
کو قتل کیا یا اپنے کسی آشنا سے قتل کرایا۔

آصفہ کا باپ میری حیرت کو غلط سمجھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اس لیے
حیران ہوا ہوں کہ مقتول نے اُس کی بیٹی کو اُس کے رشتہ داروں کی تقریب میں
جانے نہیں دیا۔ وہ اور کھُل کر باتیں کرنے لگا۔

"آپ کی بیٹی نے کبھی آپ کو بتایا تھا کہ اُسے خاوند مارتا پیٹتا
بھی ہے؟"

"ان میں لڑائی جھگڑا اکثر رہتا تھا" ـــــ اُس نے کہا ـــ "ظاہر
ہے مار پٹائی بھی ہوتی تھی۔"

میں نے اس سے مزید پوچھ گچھ روک دی۔ میری کوشش یہ تھی
کہ یہ اپنی بیٹی سے نہ ملے۔ میں نے اس کی بیٹی کو بُلایا اور نواب سے
کہا کہ وہ اُٹھ جائے۔

رات کہاں گئی تھی

"میری بات غور سے سُنو مخترمہ!" ـــــ میں نے اُسے پاس
بٹھا کر کہا ـــ "اب آپ کے ساتھ جو باتیں ہوں گی، وہ میرے اور
آپ کے درمیان رہیں گی۔ اگر آپ مجھ پر اعتماد کر کے سچّی باتیں بتا دیں
گی تو میں آپ کے سر پر ہاتھ رکھ لوں گا اور اگر آپ اس غلط فہمی میں بات
گول کرنے کی کوشش کریں گی کہ مجھے کچھ بھی علم نہیں تو میرا ہاتھ آپ کی گردن
پر ہوگا۔"

اُس نے اس طرح چونک کر میرے مُنہ کی طرف دیکھا جیسے اُس کو
بجلی کا جھٹکا پڑا ہو۔

"آپ اونچی فیملی کی خاتون ہیں" ـــ میں نے کہا ـــ "مقتول
کی خاندانی پوزیشن کچھ بھی نہیں تھی۔ میں آپ کو بچانے کی کوشش
کروں گا۔"

"آپ مجھے بچانے کی کوشش کریں گے؟" ـــ اُس نے
حیرت زدہ آواز میں پوچھا ـــ "کیا کیا ہے میں نے؟"

میں نے اُسے یہ نہ بتایا کہ مجھے اُس پر کیا شک ہے، بار بار کہا کہ
وہ سیدھی بات پر آجائے لیکن وہ اپنی ہٹ پر قائم رہی۔ ایک بار اُس
نے بڑی غصیلی آواز میں بات کی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ کسی خوش فہمی یا
غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے، میں تفتیش کر رہا ہوں۔ اگر اُس نے مجھ پر
رُعب جمانے کی کوشش کی تو میں اُسے تھانے لے جا کر تفتیش کروں
گا۔ اس سے اُس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

"مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دیں" ـــ میں نے کہا ـــ
"اور مجھے مطمئن کر کے مجھ سے آزاد ہو جائیں۔ صرف یہ بتا دیں کہ رات
کو آپ کہاں گئی تھیں؟"

اب اُس کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ اُس نے اس طرح
اِدھر اُدھر دیکھا جیسے بھاگنے کا راستہ دیکھ رہی ہو۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں مہندی کی تقریب میں گئی تھی۔"
اُس نے کہا۔

"اب آپ یہ بھی واضح کریں کہ آپ نے یہ جھوٹ کیوں بولا ہے" ـــ
میں نے کہا ـــ "میں نے بہت کوشش کی ہے کہ آپ اصل بات
پر آجائیں لیکن آپ کو اپنی عزت کا کوئی خیال نہیں۔ آپ یہ چاہتی
ہیں کہ میں آپ کے رشتہ داروں کو یہاں بُلا کر آپ کے سامنے کہلواؤں کہ
آپ وہاں نہیں گئی تھیں۔"

"انسپکٹر صاحب!" ـــــ اُس نے کچھ دیر سوچ کر کہا ـــــ "فرض کرلیں کہ میں وہاں نہیں گئی تھی۔ اس سے میرے خاوند کے قتل کا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟"

"تعلق یہ ہوسکتا ہے کہ آپ گھر میں موجود تھیں اور آپ کا خاوند آپ کے سامنے قتل ہوا ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "آپ کہیں بھی نہیں گئی تھیں۔ میں آپ کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ مجھے بتائیں کہ آپ نے جھوٹ کیوں بولا ہے۔ آپ نہیں بتائیں گی تو میں آپ کو تھانے لے جاؤں گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اُس نے سر جھکا لیا۔

"مجھے ایسا جواب چاہیئے جو مجھے مطمئن کردے" ـــ میں نے کہا۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ کو میری عزت کا بہت خیال ہے" ـــ اُس نے کہا ـــــ "میں آپ کو سچی بات بتا دیتی ہوں اور آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ میرا پردہ نہ اٹھائیں۔ میرے والد صاحب کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے کہ میں رات کہاں گئی تھی۔"

میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اُس کا پردہ رکھوں گا۔

"میں نے اپنے خاوند کو بتایا تھا کہ میں مہندی کی رسم پر جا رہی ہوں" ـــ اُس نے کہا ـــــ "لیکن میں اپنے ایک دوست کے ہاں چلی گئی تھی۔"

"کون ہے وہ؟"

اُس نے فوراً بتانے میں پس و پیش کی اور مجھے اس پر قائل کرنے لگی کہ وہ آدمی اتنا اہم نہیں کہ مجھے اُس کا ایڈریس بتایا جائے۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے اپنے شکوک رفع کرنے ہیں۔ میں اس آدمی کا نام معلوم کرکے رہوں گا۔ آخر اُس نے بتا دیا۔ وہ ایک امیرزادہ تھا۔ اُس کا خاندان دِلّی سے کچھ دُور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وہاں ان لوگوں کی بے شمار زمین تھی۔ یہ انگریزوں کی عطا کی ہوئی زمینیں تھیں۔ اُس خاندان کا یہ آدمی

کی عمر تیس سال بتائی گئی، دِلّی آتا رہتا تھا، پھر اُس نے دِلّی میں چھوٹی سی کوٹھی بنالی تھی۔ آصفہ اسی کو چاہتی تھی لیکن باپ نے اُس کو ڈاکٹر راحت بیگ کے ساتھ بیاہ دیا۔

"آپ نے اُس کی محبت کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا ہے" ـــ میں نے پوچھا۔

"یہ محبت مرنے والی نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــ "یہ بھی ایک وجہ تھی کہ ڈاکٹر مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔"

"اُس نے شادی کرلی ہوگی!"

"دو سال ہوئے اُس نے ماں باپ کے مجبور کرنے پر شادی کرلی ہے" ـــــ آصفہ نے جواب دیا ـــــ "لیکن وہ بیوی سے خوش نہیں۔"

"آپ دونوں نے کبھی ایسی بات کی ہوگی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور آپ بھی اپنے خاوند سے طلاق لے لیں گی" ـــ نے کہا۔

"ہاں!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "ایسی بات تو کئی بار ہوئی ہے۔"

"پھر رکاوٹ کیا تھی؟" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اگر باغی ہی ہونا تھا تو پوری طرح باغی ہوجاتیں۔"

"مجھے والد صاحب کا خیال آتا تھا" ـــــ اُس نے کہا۔

"میں آپ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ اس شخص کے ساتھ آپ کی دوستی کس قسم کی ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں آپ سے شاید اور بھی کچھ نہیں پوچھوں گا۔ آپ کو ایک زحمت دوں گا۔ مجھے پ کے ہاتھ کا پورا نشان چاہیئے۔"

وہ ڈر گئی۔ میں نے اسے کہا کہ یہ بہت ضروری ہے۔ اب اُس کی ایک دُکھتی رگ میرے ہاتھ میں آگئی تھی۔ میری ہلکی سی دھمکی اُسے پریشان

کر دیتی تھی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ آصفہ کی تمام انگلیوں کے نشان
کاغذ پر اُتارنے کا بندوبست کرے۔ اس کا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے۔

نوکرانی بیگم سے زیادہ خوبصورت تھی

صبح ہو گئی تھی۔ اس گھر کی نوکرانی، کلینک کا ڈسپنسر اور نوکر آ گئے
ہوئے تھے۔ میں نے پہلے نوکرانی کو بلایا۔ اُسے دیکھ کر مجھے یقین نہ آیا کہ یہ
نوکرانی ہے۔ اس کی عمر چھبیس ستائیس سال تھی۔ قد لمبوترا اور گھڑا۔ کندھے
جھکے ہوئے نہیں بلکہ سیدھے۔ جسم کی ساخت بہت اچھی۔ چہرے کے
نقوش خاص طور پر پُرکشش اور آنکھیں نشیلی۔ اُس کا رنگ گورا نہیں تھا۔
گندمی رنگ تھا جس میں سپیدی کی ہلکی سی جھلک تھی۔ اس رنگ میں
اچھی صحت اور تندرستی کا نکھار تھا۔ اُس نے سوتی کپڑے پہن رکھے تھے
جو بالکل معمولی تھے۔ اُس نے میک اپ تو دُور کی بات ہے شاید
مُنہ دھویا ہی نہیں تھا لیکن وہ آصفہ سے زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ اس
کی آنکھیں کچھ کچھ سُوجی ہوئی تھیں اور ناک سُرخ تھی۔ وہ بہت روتی تھی۔
میں نے اُسے پاس بٹھا کر نام پوچھا۔ اُس کا نام نسیم تھا۔ شادی
شدہ تھی اور تقریباً ڈیڑھ سال سے مقتول کے گھر میں ملازم تھی۔ اس
سے پہلے کہ میں اُس سے کوئی اور سوال پوچھتا، اُس نے مجھ سے پوچھا کہ
کچھ پتہ چلا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو کس نے قتل کیا ہے؟

"پتہ چلانے کی کوشش کر رہا ہوں" ـــــ میں نے کہا "میں
جو کچھ پوچھوں ٹھیک ٹھیک بتانا، پھر قاتل کا پتہ چل جائے گا"

"مجھے جو کچھ معلوم ہو گا میں بالکل ٹھیک بتاؤں گی" ـــــ اُس نے
کہا ـــــ "آپ پوچھیں"

میں نے اُس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ میں نے دیکھا کہ اس
عورت میں خوداعتمادی تھی اور اُس کی آواز میں ایسا تاثر تھا کہ اُس کی ہر

بات صحیح معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق اُس کے ساتھ
ایسا رویہ رکھا جس میں اُنس اور اپنائیت تھی۔ دو بار وہ بولتے بولتے
رو پڑی اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اُس نے مجھے جو باتیں بتائیں اُن سے
پڑوس میں رہنے والی دو عورتوں کے بیانات کی تصدیق ہو گئی۔

نسیم نے مزید یہ بتایا کہ آصفہ اور مقتول میں دشمنوں کی طرح لڑائی
جھگڑا ہوتا تھا۔ ایک بار آصفہ نے ڈنڈا اُٹھا لیا اور ڈاکٹر کو تین چار ضربیں
لگائیں۔ ڈاکٹر نے اس سے ڈنڈا چھین کر پھینک دیا اور اُسے تھپڑ مارے۔
ایک بار ان میں لڑائی جھگڑا ہو گیا تو آصفہ نے شیشے کا جگ اٹھا کر ڈاکٹر
کو پتھر کی طرح مارا۔ ڈاکٹر آگے سے ہٹ گیا اور جگ دیوار کے ساتھ
لگ کر ٹوٹ گیا۔ آصفہ نے چائے دانی اُٹھا لی۔ ڈاکٹر دوڑ کر کمرے سے
نکل گیا۔ نسیم وہاں موجود تھی۔ اس نے آصفہ کو پکڑا اور اُسے دوسرے کمرے
میں لے گئی۔

"ان کا جھگڑا عموماً کس بات پر ہوا کرتا تھا؟"

"میں نے کبھی بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی" ـــــ نسیم نے
جواب دیا ـــــ "میں صرف یہ جانتی ہوں کہ بیگم صاحبہ کو اچانک غصہ
آ جاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے دَورہ پڑتا تھا۔ یہ عورت پاگل ہو جاتی ہے۔
اس کی یہ حالت آدھا گھنٹہ یا اس سے چند منٹ زیادہ رہتی ہے، پھر
یکلخت ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ غُصے کی حالت میں برتن آگے آ جائے تو
اسے توڑ دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذرا ذرا سی بات اسے بُری لگتی ہے،
اور اس حالت میں یہ لڑائی جھگڑے اور مار کٹائی کے سوا کچھ اور سوچ ہی
نہیں سکتی"

"ٹھنڈی پڑ جانے کے بعد اس کی حالت کیا ہوتی ہے؟" ـــــ میں
نے پوچھا ـــــ "اسے پچھتاوا سا ہوتا تھا کہ یہ غصے میں نہ جانے کیا کر بیٹھی یا
کیا کہہ بیٹھی ہے؟"

"نہیں" ـــــ نسیم نے جواب دیا ـــــ "یہ کوشش کرتی ہے کہ

ثابت ہو جانے کہ اس کا غصّہ بلا وجہ نہیں تھا اور اس میں ڈاکٹر صاحب کا قصور ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو تو یہ ہر خرابی کا قصوروار سمجھتی تھی۔"

میں نے یہ سوال کہ غصّے کے دورے کے بعد اس کا ردِ عمل کیا ہوتا تھا، ویسے ہی نہیں پوچھ لیا تھا۔ مجھے نفسیات کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ تھی۔ اس کے علاوہ میں نے پہلے بھی ایسے دو تین کیس دیکھے تھے۔ اچانک غصّے کا دورہ پڑ جانا نفسیاتی معاملہ ہوتا ہے۔ ایسے زیادہ تر کیسوں میں یوں ہوتا ہے کہ غصّہ ختم ہو جانے کے بعد وہ پچھتانے لگتے ہیں۔ یہ ان کی ذہنی اذیت کا دوسرا مرحلہ ہوتا ہے۔ کوئی کوئی کیس ایسا ہوتا ہے جو دورہ ختم ہونے پر اپنے غصّے کو حق بجانب ثابت کرتا ہے۔ وہ پچھتانا نہیں چاہتا۔ اپنی خامی کو جو دراصل نفسیاتی مرض ہوتا ہے، چھپانے کے لیے جھوٹ بولتا اور عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے۔ آصفہ اسی قسم کی مریضہ معلوم ہوتی تھی۔

"دیکھو نسیم!" — میں نے کہا — "تم ملزم نہیں ہو۔ میں تم سے رہنمائی لے رہا ہوں۔ اگر تمہارے دل پر میرا ذرا سا بھی ڈر ہے تو وہ دل سے اتار دو..... مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں ڈاکٹر کے قتل ہو جانے کا افسوس ہے یا آصفہ کے بیوہ ہو جانے کا؟"

"ڈاکٹر صاحب کے قتل کا مجھے بہت افسوس ہے" — نسیم نے کہا اور اس کے آنسو بہنے لگے۔

"آصفہ کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے تھے؟" — میں نے پوچھا — "کیا وہ تمہیں اچھا جانتی تھی؟"

"یہ بات اگر آپ بیگم صاحبہ سے پوچھیں تو آپ کو صحیح جواب ملے گا" — نسیم نے کہا — "میں اپنی زبان سے اپنے حق میں کوئی بات نہیں کہوں گی۔"

"میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں" — میں نے کہا — "میں تصدیق کر لوں گا۔"

"بیگم صاحبہ کے ساتھ میرے تعلقات بہت اچھے تھے" — اس نے کہا — "وہ مجھے اتنا پسند کرتی ہیں کہ دل کی باتیں میرے ساتھ کر لیتی ہیں۔"

"پھر تو تم مجھے بہت کچھ بتا سکتی ہو نسیم!" — میں نے دوستانہ لہجے میں کہا — "میں تمہیں ایک بات کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں.... تم جانتی ہو کہ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے۔ اگر تم کوئی بات مجھ سے چھپا لو گی اور وہ مجھے کسی اور سے معلوم ہو گی تو یہ تمہارا جرم تصور کیا جائے گا.... نہیں نسیم! میں تمہیں کسی تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتا..... مجھے یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر کا رویّہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟"

"ان کی بات کچھ اور تھی صاحب!" — اس نے کہا — "ڈاکٹر صاحب مشفق انسان تھے۔ میرے ساتھ ان کا رویّہ بہت ہی اچھا تھا۔ وہ مجھے نوکرانی سمجھتے ہی نہیں تھے۔ میرا خاوند اکثر بیمار رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسے ہمارے گھر آ کر دیکھتے اور مفت علاج کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب میں غصّہ تو تھا ہی نہیں۔"

خاوند والا پیار نہیں دے سکوں گی

میں نے نسیم سے کئی ایک باتیں پوچھیں۔ اس نے جرأت اور خود اعتمادی سے ہر بات بتائی۔ اتنی لمبی چوڑی پوچھ گچھ کا اختصار یہ تھا کہ نسیم نے آصفہ کے خلاف بہت سی باتیں بتائیں اور ڈاکٹر کی اتنی زیادہ تعریفیں کیں جنہوں نے میرے ذہن میں شک پیدا کر دیا۔ اس نے جذبات کے جوش سے یہاں تک کہا — "بیگم صاحبہ تو ڈائن ہیں۔ ہر وقت میک اپ کیے رکھتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کو تو یوں دیکھتی تھیں جیسے انہیں کھا جانا چاہتی ہوں۔ مجھے یہ عورت صاف نہیں لگتی۔"

میرے ذہن میں جو شک پیدا ہو گیا تھا، وہ پکا ہونے لگا۔ میں

نے نسیم کو اب بدلی ہوئی نظروں سے دیکھا اور بڑی غور سے دیکھا۔ اس جوان عورت کا ظاہری ناک نقشہ تو اچھا تھا ہی، اُس میں کچھ تاثر اور رنگ تھا جس کا تعلق جسمانی طور پر چہرے کے ساتھ نہیں تھا لیکن اس نے اُس کے چہرے کو زیادہ حسین بنا رکھا تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ نسیم میں آصفہ کی نسبت زیادہ کشش تھی۔ اگر اُسے آصفہ جیسے قیمتی کپڑے پہنا دیئے جاتے، اُس کا میک اَپ کر دیا جاتا اور اس کے بال سنوارے ہوئے ہوتے تو وہ کسی نوّاب خاندان کی امیرزادی لگتی۔

میرا شک یہ تھا کہ ڈاکٹر نے اس کے ساتھ درپردہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ یہ تو مجھے آصفہ ہی بتا سکتی تھی کہ میرا شک کہاں تک درست ہے۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ آصفہ کو ان پر ذرا سا بھی شک ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتاتی۔ میں نے اُس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کسی ایک عورت کا نام بتا دے جس کا ڈاکٹر کے ساتھ دوستانہ تھا۔ آصفہ مجھے کوئی نام نہیں بتا سکی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آصفہ کو معلوم نہ تھا۔ مجھے بہرحال معلوم کرنا تھا۔ چوڑیوں کے ٹکڑے بتا رہے تھے کہ واردات کے ساتھ عورت کا تعلق ہے۔ عورت نسیم بھی ہو سکتی تھی لیکن اُس نے جو چوڑیاں پہن رکھی تھیں وہ کسی اور رنگ اور قسم کی تھیں۔

"نسیم!" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب تم پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھے۔ وہ تمہیں نوکرانی نہیں سمجھتے تھے۔"

اُس نے میری پوری بات بھی نہ سُنی۔ آہ لے کر بولی ــــ "اگر آپ کو یہ شک ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میرا ناجائز تعلق تھا تو یہ شک دل سے نکال دیں۔ اُن کے ساتھ میرا تعلق گہرا تھا۔"

میں حیران ہو گیا کہ یہ عورت میرا اشارہ فوراً سمجھ گئی تھی۔ اُس نے جس انداز سے میرا شک رفع کرنے کی کوشش کی، وہ اتنا پختہ تھا کہ میں نے اُس کی بات کو صحیح مان لیا لیکن مجھے اتنی جلدی نہیں مان لینا چاہئیے تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ گہرے تعلق کا کیا مطلب ہے۔

"ہم جیسے لوگ پیٹ کے بھوکے ہوتے ہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "ہمیں روٹی اور پیسے کی بھوک ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کو پیار کی بھوک تھی۔ بیگم صاحبہ کے پاس اُن کے لیے پیار نہیں غصّہ اور نفرت تھی، بلکہ یہ عورت انہیں دھتکار کر رکھتی تھی۔ ایک سال پہلے کی بات ہے بیگم صاحبہ دو تین دنوں کے لیے اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی تھیں۔ میں شام کو کام سے فارغ ہو کر گھر جانے کے لیے ڈاکٹر صاحب سے اجازت لینے گئی تو انہوں نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگے، نسیم! ذرا دیر میرے پاس بیٹھ نہیں سکو گی؟ میں نے کہا، کیوں نہیں بیٹھ سکوں گی ....

"پہلے تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میرے خاوند کی صحت کے متعلق پوچھا پھر اپنے متعلق باتیں کیں۔ مجھے ایک شک ہوا۔ بیگم صاحبہ کہا کرتی تھیں کہ یہ شخص بدکار ہے۔ عورتوں کو پھانستا رہتا ہے۔ مجھے یہی خیال آیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اسی نیّت سے مجھے روکا ہے۔ وہ گھر میں اکیلے تھے، میری نیّت صاف ہے اور میں اپنے اللہ کو یاد کرنے والی عورت ہوں۔ اس گھر میں نوکری ملنے سے پہلے مجھے ایسے ہی ایک امیر گھر کی نوکری ملی تھی۔ وہاں دو بچّے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہاں بڑا اچھا وقت گزرا۔ ایک روز بچّوں کا باپ گھر میں اکیلا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور میرے ہاتھ میں دس دس کے معلوم نہیں کتنے نوٹ دے کر اپنی نیّت کا اظہار کر دیا۔ خدا کی قسم، مجھے غصّہ نہ آیا۔ میں نے حساب لگایا کہ اس مہینے کے پندرہ سولہ دن گزر گئے تھے۔ اُس نے مجھے جو نوٹ دیئے تھے، ان میں سے میں نے آدھے مہینے کی تنخواہ رکھ لی اور اُسے کہا کہ میں نے اپنی تنخواہ رکھ لی ہے، یہ آپ کے باقی پیسے ہیں۔ اُسے نوٹ واپس کر کے میں چلی آئی۔ پھر وہاں نہ گئی ....

"اب ڈاکٹر صاحب مجھے اپنے پاس بٹھا رہے تھے۔ میں انہیں آزمانے کے لیے بیٹھ گئی۔ انہوں نے بڑی لمبی بات کی کہ وہ پیار کی پیاس اور تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی ماں بھی مر گئی اور ایک بہن تھی، وہ بھی مر گئی۔

میں نے اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ مجھ پر ایسا اثر ہُوا کہ میں صوفے پر اُن کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں اُن کے پاس بیٹھی مگر انہوں نے بُری نیت کا اشارہ تک نہ کیا۔۔۔۔

"بیگم صاحبہ چار روز اپنے ماں باپ کے گھر رہیں۔ ہر روز ایسے ہوتا کہ رات کو میں کام سے فارغ ہوتی تو ڈاکٹر صاحب مجھے اپنے پاس بٹھا لیتے۔ دوسرے روز وہ صوفے پر اس طرح لیٹ گئے کہ ان کا سر میری گود میں تھا۔ انہوں نے مجھے میری پورے مہینے کی تنخواہ جتنی رقم دی۔ میں نے نہیں لی میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب! اگر آپ کو پیار چاہیئے تو پیار خریدا نہیں جا سکتا اور اگر آپ مجھ سے میرے خاوند والا پیار چاہتے ہیں تو وہ نہیں دے سکوں گی۔۔۔۔

"انہوں نے فوراً پیسے پرے پھینک دیئے اور کہنے لگے کہ جب بھی تمہیں مجھ پر ایسا شک ہُوا، مجھے دھتکار دینا۔۔۔۔ صاحب! اس ایک سال میں بے شمار موقعے آئے کہ بیگم صاحبہ سیر سپاٹے کے لیے نکل گئیں اور ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اگر کوئی ہمیں بیٹھے ہوئے دیکھ لیتا تو قسم کھا کر کہتا کہ ان کے تعلّقات ناجائز ہیں۔ اللہ گواہ ہے کہ ہمارے تعلقات کیسے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ کسی کی بیوی کو کسی کے خاوند کے پاس نہیں بیٹھنا چاہیئے لیکن میں اسے جائز سمجھتی رہی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی میری یہ کوٹھی لے لے، میں جھونپڑے میں رہوں گا لیکن اس کے عوض مجھے سچا پیار دے دے۔ میں نے انہیں جی بھر کے پیار دیا۔"

"ڈاکٹر نے کبھی تو تمہیں کہا ہوگا کہ وہ تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"کبھی اشارہ بھی نہیں کیا تھا" ——— نسیم نے کہا ——— "وہ میرے ساتھ بچّوں کی طرح کھیلا کرتے تھے، ہم بچّوں کی طرح گتھم گتھا بھی ہو جایا کرتے تھے، لیکن اُن کی نیّت میں کبھی خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران میرا خاوند چار پانچ مرتبہ بیمار ہُوا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا تو وہ اس طرح گھبرا گئے جیسے اُن کے سگے بھائی کو کچھ ہو گیا ہو۔ وہ میرے

گھر آ کر میرے خاوند کو دیکھا کرتے تھے۔"

طلاق لینا چاہتی تھی

"میں مان لیتا ہوں نسیم!" ——— میں نے کہا ——— "تم نے جو کچھ کہا ہے اسے سچ مان لیتا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ ڈاکٹر کے ساتھ تمہارے تعلّقات کیسے تھے۔ اگر تمہاری اور اس کی محبّت پاک تھی تو یہ اچھّی بات تھی۔ اگر محبّت پاک نہیں تھی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ تم اور بھی بہت کچھ جانتی ہو۔ تم میری مدد کر سکتی ہو۔ میں تمہیں صاف بات کہہ دیتا ہوں۔ مجھے تمہاری بیگم صاحبہ پر شک ہے۔"

"اس نے ڈاکٹر صاحب کو قتل کرایا ہے؟" ——— نسیم نے پوچھا ——— "آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا!"

"بالکل یہی!" ——— میں نے کہا۔

اُس نے نظریں جھکا لیں، پھر اُس نے اپنے نیچے والا ہونٹ ایک طرف سے دانتوں میں لے لیا۔ یہ اضطراب کی علامت تھی۔ میں اُسے دیکھنے لگا۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں بے چینی صاف نظر آ رہی تھی۔ بے چینی کا اظہار اُس نے یوں بھی کیا کہ اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ سے چٹخانے لگی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے کوئی خاص بات اپنے سینے میں روک رکھی ہے۔

"زیادہ نہ سوچو نسیم!" ——— میں نے کہا ——— "مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔"

"میں کچھ چھپا نہیں رہی" ——— نسیم نے کہا ——— "آپ نے بیگم صاحبہ پر شک کا اظہار کیا ہے تو مجھے کچھ باتیں یاد آ گئی ہیں۔ ان سے مجھے بھی شک ہونے لگا ہے۔ مثلاً دو تین مرتبہ بیگم صاحبہ نے کہا تھا ——— 'میں ڈرتی ہوں ورنہ [illegible] سے لیے مشکل

ہیں' ——— ایک بار اس نے یہی بات کہہ کے یہ بھی کہا تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ میرے ہی ہاتھوں سے مرے گا ....

"میں ایک بات آپ کو بتا ہی دوں تو اچھا ہے۔ تین چار مہینے گذرے، بیگم صاحبہ نے مجھے کہا تھا ——'نسیم! مجھے تم سے اتنا پیار ہے جتنا سگی بہنوں اور رازدار سہیلیوں کے ساتھ بھی نہیں ہوتا۔ میرے دل کی وہ کون سی بات ہے جو تمہیں معلوم نہیں۔ میرا ایک کام کر دو۔ خدا کی قسم، نوٹوں سے تمہاری جھولی بھر دوں گی' —— میں نے اس سے پوچھا کہ کام کیا ہے؟"

آصفہ نے نسیم کو جو کام بتایا وہ میں آپ کو اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔ آصفہ نے اُسے کہا کہ ایک رات وہ ڈاکٹر کو یہ بتا کر کہ وہ تین چار گھنٹوں کے لیے اپنے ماں باپ کے گھر جا رہی ہے، چلی جائے گی۔ پھر وہ پورے ایک گھنٹے بعد واپس آ جائے گی۔ نسیم سے اُس نے کہا کہ وہ اپنے گھر نہ جائے بلکہ ڈاکٹر کے پاس بیٹھ جائے اور اُس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرے جس سے ڈاکٹر کو یہ تاثر ملے کہ نسیم اُسے اپنا آپ پیش کر رہی ہے۔ آصفہ نے اُسے کہا کہ وہ پورے ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر کی گود میں بیٹھ جائے اور بازو اُس کی گردن میں ڈال لے۔ اس سے پہلے وہ شراب کی بوتل اور دو گلاس تپائی پر رکھ لے۔ آصفہ نے اُسے کہا کہ وہ اپنے باپ کو ساتھ لے آئے گی۔ ڈاکٹر کو یہ تسلی ہوگی کہ آصفہ تین چار گھنٹوں بعد آئے گی۔

آصفہ کی سازش یہ تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر جائے گی اور انہیں کہے گی کہ اس کا خاوند بدکار آدمی ہے اور اس نے نوکرانی کے ساتھ قابلِ اعتراض دوستی لگا رکھی ہے۔ آصفہ اپنے باپ کو بھڑکائے گی کہ وہ اُس کے ساتھ ابھی چلے۔ آصفہ اپنے باپ کو یہ منظر دکھا کر مجبور کر دینا چاہتی تھی کہ وہ آصفہ کو ڈاکٹر سے طلاق دلوا دے۔

"خدا کی قسم انسپکٹر صاحب!" —— نسیم نے مجھے یہ بات سناتے ہوئے کہا —— "میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے جی میں آئی کہ یہ

اس عورت کے منہ پر تھوک دوں لیکن میں نوکرانی تھی۔ میں نے اتنا ہی کہا کہ بیگم صاحبہ! میں یہ گناہ نہیں کر سکوں گی۔ بیگم صاحبہ نے مجھے بے شمار انعام کا لالچ دیا اور یہ بھی کہا کہ انہیں طلاق مل گئی تو ان کی شادی ایک خاندانی امیرزادے کے ساتھ ہوگی اور وہ مجھے اپنے ساتھ رکھیں گی۔ میں نے پھر بھی انکار کیا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے دس روپے کا نوٹ دے کر کہا کہ اب اتنا ہی کام کرو کہ اس کا کسی کے ساتھ ذکر نہ کرنا۔ میں نے دس روپے نہ لیے اور انہیں کہا کہ میں آپ کا نمک کھا رہی ہوں۔ آپ کے راز کو اپنا راز سمجھوں گی۔"

نسیم نے مجھے چند اور باتیں بھی بتائیں لیکن وہ بڑی چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم سی باتیں تھیں۔ ان سے یہ تاثر ملتا تھا کہ آصفہ بہت زیادہ قیمت دے کر بھی مقتول سے طلاق لینا چاہتی تھی۔ یہ مجھے پتہ چل چکا تھا کہ آصفہ کا باپ بھی مقتول کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ طلاق سے ڈرتا تھا۔

نسیم سے پوچھنے والی اور کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے اُسے سختی سے کہا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ میری اور اس کی کیا باتیں ہوئی ہیں۔ نسیم مجھ پر گہرا تاثر چھوڑ کر چلی گئی۔ اُسے ابھی کوٹھی کے احاطے کے اندر ہی رہنا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بُلا کر کہا کہ نسیم کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان کاغذ پر اتارنے کا بندوبست کرے۔

صحیح تھا کہ میں اس عورت سے متاثر ہوا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ اپنے متعلق اور ڈاکٹر کے متعلق اس نے جو بیان مجھے دیا تھا، وہ صحیح ہوتا۔ دو تین ذرائع سے تصدیق کرائے بغیر کسی کے بیان کو سچا سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہوتی ہے۔

خاوند پرانی عمر کا، بیوی جوان

مجھے بتایا گیا تھا کہ مقتول کے کلینک کا ڈسپنسر اور نوکر آنے

ہوئے ہیں۔ ڈسپنسر سے میں نے اپنے انداز سے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھا۔ اُس سے مجھے جو نئی بات معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ڈاکٹر عورتوں کے ساتھ خاص طور پر بڑا اچھا سلوک کرتا تھا۔ ڈسپنسر نے آصفہ کے اس الزام کو غلط کہا کہ ڈاکٹر کو جو عورت پسند آتی تھی، اُسے وہ اپنے پاس بٹھا لیتا تھا۔

"میں صرف ایک عورت کے متعلق یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ جب آتی تھی تو ڈاکٹر کے پاس کم از کم ایک گھنٹہ بیٹھتی تھی" — ڈسپنسر نے کہا —— "وہ اُس وقت آتی تھی جب مریض جا چکے ہوتے تھے"۔

"کون ہے وہ؟"

"مجھے اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ سکھ ہے" — ڈسپنسر نے جواب دیا — "اُس کا خاوند پُرانی عمر کا ہے۔ عورت جوان ہے۔ چوبیس پچیس سال عمر کی ہوگی۔ خوبصورت عورت ہے۔ کئی مہینے گذرے، وہ اپنے خاوند کے ساتھ پہلی بار ڈاکٹر صاحب کے پاس آئی تھی۔ اُس کے خاوند کو ہم اُس کا باپ سمجھے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ اُس کا خاوند ہے۔ اُس روز کے بعد وہ اکیلی آتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب اُس کے ساتھ بہت خوش ہوتے تھے۔ کبھی کبھی اُسے ساتھ لے کر چلے جاتے تھے"۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اُس دور میں نہ ڈاکٹروں کی اتنی بھرمار تھی کہ جدھر دیکھو ڈاکٹروں کے کلینک نظر آتے ہیں نہ مریضوں کی اتنی زیادہ تعداد تھی۔ آج کل تو ڈاکٹروں کے ہاں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اُس زمانے میں ڈاکٹر فارغ بیٹھے رہتے تھے۔ اگر اُس وقت کوئی ڈاکٹر کسی مریض یا مریضہ کو بہت دیر تک اپنے پاس بٹھائے رکھتا تھا تو اُسے یہ ڈر نہیں ہوتا تھا کہ باہر مریض انتظار کر رہے ہیں۔

ڈسپنسر کے بعد ڈاکٹر کے نوکر سے پوچھ گچھ کی۔ اُس سے بھی یہی پتہ چلا کہ سکھوں کی ایک بڑی خوبصورت لڑکی ڈاکٹر کی دوست بن گئی تھی۔ اُسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتی تھی۔ اُس کے بوڑھے

خاوند کو انہوں نے صرف ایک ہی بار دیکھا تھا۔

دن کے تین بج چکے تھے۔ مقتول کی لاش پوسٹمارٹم کے بعد آ گئی۔ میں نے واردات والے کمرے اور ٹیلیفون والے کمرے کو بند کر دیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میں قاتل کا سراغ لگا لوں گا۔ مجھے کئی طرح کی احتیاط کرنی تھی۔ یہ شہر تھا اور ملک کا دارالحکومت تھا۔ یہاں سے اخبار بھی نکلتے تھے۔ ان کے نامہ نگار آ گئے تھے۔ وہ مجھ سے واردات کی تفصیلات پوچھ رہے تھے اور یہ بھی کہ میں نے کس کس کو شاملِ تفتیش کیا ہے اور مجھے کس پر شک ہے۔ میں نے انہیں تفصیلات نہ بتائیں نہ یہ کہ مجھے کس پر شک ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ شہر میں احتیاط کی ضرورت تھی۔ دیہات میں تو تھانیدار دھاندلی بھی چلا لیا کرتے تھے۔ وہاں تھانیدار کو مہاراجہ اور نواب سمجھا جاتا تھا لیکن شہر میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ ڈر ہوتا تھا کہ کوئی اوپر رپورٹ نہ کر دے کہ تھانیدار جانبداری سے کام لے رہا ہے یا کسی مشتبہ پر تفتیش کے دوران تشدد کیا گیا ہے۔

جب لاش ہسپتال سے آئی تو میں کوٹھی کے ایک کونے والے کمرے میں جا بیٹھا۔ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر وہاں سے آ نہیں سکتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ میں وہاں سے قاتل کو گرفتار کر کے ہی لاتا۔ یہ ممکن بھی نہیں تھا لیکن ایسے مشتبہ افراد کو ساتھ لانا ضروری تھا جن کے متعلق پکا شک ہوتا۔ میرا پکا شک آصفہ پر تھا اور نسیم کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ قاتل نسیم نہیں لیکن یہ شک بے بنیاد نہیں تھا کہ نسیم قتل کا باعث ہو سکتی ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ دو ڈاکٹر مجھے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں بلا لیا۔ وہ مقتول کی عمر کے تھے۔ میڈیکل کالج میں یہ مقتول کے کلاس فیلو تھے۔ پھر انہوں نے کسی سرکاری ہسپتال میں اکٹھے نوکری کی تھی۔ اس کے بعد وہ الگ الگ نوکری یا پرائیویٹ پریکٹس کرنے لگے لیکن ان کی دوستی اور میل ملاقات جاری رہی۔ تینوں دلّی میں تھے۔

وہ دونوں بہت پریشان تھے۔ اپنے دوست کے قتل کا انہیں بہت غم تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا ——— "یہاں تو اس بے چارے کی میت پر رونے والا بھی کوئی نہیں۔ اس کا باپ گاؤں میں ہے۔ اُسے پتہ چلے گا کہ راحت قتل ہو گیا ہے تو اُس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"

یہ دونوں مسلمان تھے اور اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مجھ سے پُوچھنا چاہتے تھے کہ قاتل کا سراغ ملا ہے یا نہیں، اور وہ مجھے مقتول کے متعلق کچھ بتانا بھی چاہتے تھے۔ مجھے ایک اور ضروری کارروائی کرنی تھی۔ اے۔ ایس۔ آئی آ گیا تھا۔ میں نے اُسے اس واردات کے سلسلے میں کچھ کام بتا رکھے تھے جن میں ایک یہ تھا کہ شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل، دونوں گلاسوں، ٹیلیفون کے ریسیور اور سیٹ پر انگلیوں کے جو نشان ہیں انہیں محفوظ کرے۔

آصفہ نے ایک اعتراف کیا تھا۔ وہ مہندی کی رسم کے بہانے اُس امیرزادے کے ہاں چلی گئی تھی جس کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتی تھی لیکن باپ نے اُسے مقتول ڈاکٹر کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ اُسے شاملِ تفتیش کرنا تھا۔ میں نے آصفہ سے اُس کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی کو یہ پتہ دے کر کہا کہ وہ اس امیرزادے کو لے آئے۔ میرا شک یہ تھا کہ مقتول کو آصفہ نے اس امیرزادے کے ہاتھوں قتل کرایا ہے۔

ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے مشکوک

میرے دماغ میں ایک اور بات اٹکی ہوئی تھی۔ قتل ایک تو فوری اشتعال پر ہوتا ہے۔ مثلاً کسی نے اپنے گھر کی کسی عورت کو کسی غیر مرد کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ لیا اور اشتعال میں آ کر اُسے قتل کر دیا یا لڑائی جھگڑا ہو گیا اور ایک کو اتنا غصہ آیا کہ اُس کے ہاتھ میں جو چیز آ گئی وہ دوسرے کے سر پر مار کر مار ڈالا۔ ایک قتل باقاعدہ منصوبہ بندی سے

ہوتا ہے۔ اس میں زہر یا ریوالور، بندوق یا چھُری چاقو استعمال ہوتا ہے یا سوتے میں گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر کا قتل فوری اشتعال والی واردات معلوم ہوتی تھی۔ اگر اس قتل کی سازش پہلے تیار کی ہوئی ہوتی یعنی یہ PLANNED MURDER ہوتا تو ڈاکٹر کو شراب کی بوتل سے نہ مارا جاتا بلکہ شراب میں زہر ملایا جاتا، یا کرائے کا کوئی قاتل آتا اور ڈاکٹر کو ریوالور کی گولی مار کر یا خنجر یا چاقو سے دو تین مہلک وار کر کے غائب ہو جاتا۔ بوتل سے مارنے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ لوگ ایک عورت کو ساتھ بٹھائے شراب پی رہے تھے۔ نشے کی حالت میں ان کی لڑائی ہو گئی اور کسی نے بوتل اُٹھا کر ڈاکٹر کو مارنا شروع کر دیا۔

ٹیلیفون کی جو تار کٹی ہوئی تھی، اس کے متعلق میرا قیاس یہ تھا کہ ان میں سے کسی نے پولیس سٹیشن فون کرنا چاہا اور کسی دوسرے نے اُس کے ہاتھ سے فون چھیننے کے لیے اتنی زور سے کھینچا کہ ریسیور کی تار ٹوٹ گئی۔

سوال یہ تھا کہ ان کے ساتھ جو عورت تھی وہ کیا آصفہ تھی یا کوئی اور تھی؟ آصفہ نے تو کہہ دیا تھا کہ وہ امیرزادے کے ہاں چلی گئی تھی جس کا نام عمران تھا۔ مجھے عمران سے معلوم کرنا تھا کہ آصفہ اُس کے پاس گئی تھی یا نہیں۔

میرے پاس دو ڈاکٹر بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ قاتل کا سراغ ملا ہے یا نہیں۔ میں نے اُنہیں کہا کہ سراغ مِل جائے گا لیکن میرے سامنے پورا پس منظر نہیں آ رہا۔ قتل کی بیک گراؤنڈ معلوم ہو جائے تو قاتل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

یہ دونوں ڈاکٹر عقل اور تمیز والے تھے۔ ایک کی تو آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ انہیں کس پر شک ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر دونوں میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ بے خوف ہو کر بے تکلفی سے بات کریں۔ میں کسی کو پتہ نہیں چلنے دوں گا کہ اُنہوں نے مجھے کسی کے خلاف کوئی بات بتائی ہے۔ میں نے انگریزی کے چار پانچ موٹے موٹے الفاظ بول کر اُن پر یہ دھونس جمائی کہ

میں مڈل پاس تھانیدار نہیں ہوں، بہت پڑھا لکھا ہوں۔

"ہم دونوں کو راحت کی بیوی پر شک ہے" ——— ایک ڈاکٹر نے کہا۔

"شک کی وجہ کیا ہے؟" ——— میں نے پوچھا۔

"بیوی نے راحت کو قبول نہیں کیا تھا" ——— اُس نے جواب دیا۔

"بیوی کو شکایت ہے کہ مقتول راحت عورتوں کا رسیا تھا" ——— میں نے کہا ——— "اور وہ شراب بھی پیتا تھا۔ شراب کی بوتل سے ہی اُسے قتل کیا گیا ہے۔ وہ گھر میں شراب پی رہا تھا"۔

"اُس کا پیشہ عیاشی اور بدکاری والا پیشہ نہیں تھا" ——— ایک ڈاکٹر نے کہا ——— "اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو ڈاکٹر راحت کی بیک گراؤنڈ بتا دوں" ——— میرے کہنے پر اُس نے کہا ——— "راحت دیہاتی اور غریب خاندان کا فرد تھا۔ کہتے ہیں ڈاکٹری صرف امیروں کے بچے پڑھ سکتے ہیں لیکن راحت نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اس نے مفلسی اور محرومیوں میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری لی اور اس مقام پر پہنچا کہ اچھی سوسائٹی کا ڈاکٹر بنا اور اس نے یہ کوٹھی بنائی"۔

اس نے تفصیل سے مقتول کا ماضی بیان کیا تھا جو میں نے آپ کو مختصراً بتایا ہے۔

"راحت میں ابتدائی زندگی کی محرومیوں نے یہ خامی پیدا کر دی کہ پیار کی تشنگی محسوس کرنے لگا" ——— راحت کے دوست ڈاکٹر نے کہا ——— "اس نے پیار کی بہت قیمت ادا کی۔ مریضوں کو، خاص طور پر مریض عورتوں کو اُس نے اتنا خلوص اور پیار دیا کہ دیکھنے والوں کو شک ہوتا تھا کہ یہ عورتوں کا شوقین ہے ....

"راحت کو جب ایک ملنے والے نے آصفہ کے باپ سے متعارف کرایا اور آصفہ کے رشتے کی بات چلی تو ہم دونوں نے راحت سے کہا تھا کہ

اِن لوگوں کے متعلق انکوائری کر لینے دو لیکن راحت کہتا تھا کہ وہ زندگی کے ساتھی کی ضرورت بڑی شدّت سے محسوس کر رہا ہے۔ اُس نے ہمیں کچھ نہ کرنے دیا اور شادی کر لی۔ ایک ہی مہینہ گذرا تھا کہ راحت نے اپنی بیوی کے متعلق بتایا کہ اس بیوی کے ساتھ اس کی نہیں بن سکے گی۔ کہتا تھا کہ بیوی اُسے قبول نہیں کر رہی۔ اس کے بعد آصفہ نے راحت کو پرے پرے رکھنا شروع کر دیا ....

"ہم دونوں نے اِدھر اُدھر سے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ آصفہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں۔ اس کا رشتہ ان کی اپنی کلاس کے ایک آدمی عمران کے ساتھ ہو چکا تھا لیکن عمران نے آصفہ کو کسی وجہ سے شاید ذہنی خرابی کی وجہ سے قبول نہ کیا۔ پھر ایک اور آدمی کے ساتھ رشتہ ہُوا مگر ان لوگوں نے بھی اِدھر اُدھر سے پوچھا تو انہیں پتہ چل گیا کہ لڑکی ذہنی طور پر صحیح نہیں، اور اخلاقی لحاظ سے بھی مشکوک ہے۔ آخر راحت کو گھیر لیا گیا۔ ہم دونوں پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ آصفہ کو راحت پر ٹھونسا گیا تھا۔ خود باپ اپنی اس بیٹی سے تنگ ہو گا۔ اُس نے اسے چلتا کیا۔ آصفہ کا باپ اور اس کے بھائی اتنے مغرور ہیں کہ وہ راحت کی فیملی بیک گراؤنڈ دیکھ کر اسے کبھی اپنا داماد نہ بناتے۔ وہ تو نوابوں کا خاندان ہے ....

"راحت چالاک آدمی نہیں تھا۔ آصفہ کا اذیّت ناک سلوک برداشت کرتا رہا۔ وقت گذرتا رہا اور یہ وقت آگیا۔ ہمارے ساتھ راحت اپنا رونا رویا کرتا تھا۔ ہم اسے کہتے تھے کہ آصفہ کو طلاق دے دو۔ وہ نہیں مانتا تھا۔ اُس نے ہمیں کئی بار کہا تھا کہ آصفہ کا سلوک بالکل دشمنوں جیسا ہو گیا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ کسی روز آصفہ اسے دھوکے میں زہر پلا دے گی ...

"تقریباً ایک سال سے راحت ہمیں بتا رہا تھا کہ اس کی نوکرانی بہت اچھی ہے۔ آصفہ کبھی گھر سے غیر حاضر ہوتی تھی تو راحت اس نوکرانی کو اپنے پاس بٹھا لیتا تھا"۔

"نوکرانی کے ساتھ راحت کے تعلقات کیسے تھے؟" ——— میں نے پوچھا۔

"ناجائز نہیں تھے" ——— دوسرے ڈاکٹر نے کہا ——— "راحت ایسا آدمی نہیں تھا۔ اُس کا فطری مطالبہ کچھ اور تھا"

ان دونوں ڈاکٹروں نے مقتول اور نسیم کے تعلقات کی وہی باتیں سنائیں جو نسیم مجھے سُنا چکی تھی۔ یہی تفصیلات مقتول ڈاکٹر نے اپنے ان دوستوں کو بھی سنائی تھیں۔

وہ حیوان تھی

"آپ دونوں مقتول کی ذاتی زندگی کے متعلق ہر بات جانتے ہیں" ——— میں نے دونوں ڈاکٹروں سے کہا ——— "کیا آپ کسی سکھ لڑکی کو جانتے ہیں جس کے ساتھ راحت کا گہرا لگاؤ تھا؟"

"اُسے بھی جانتے ہیں" ——— ایک ڈاکٹر نے کہا ——— "اُسے بھی ہم دونوں نے دیکھا ہے لیکن یہ لگاؤ راحت کو پریشان کر رہا تھا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ راحت کچھ اور چاہتا تھا اور یہ لڑکی کچھ اور چاہتی تھی" ——— اُس نے جواب دیا ——— "اس سکھ لڑکی کا نام سرجیت کور ہے۔ اچھی خاصی خوبصورت لڑکی ہے۔ راحت کی ایک بہن جوانی میں مر گئی تھی۔ بہن بھائی کا آپس میں بہت پیار تھا۔ ایک شام ہم دونوں راحت کے کلینک میں گئے۔ اُس کے پاس یہ لڑکی سرجیت کور بیٹھی ہوئی تھی ہمیں دیکھ کر وہ چلی گئی۔ وہ ہنستی مسکراتی ہوئی گئی تھی۔ ہم دونوں نے مذاق کے لہجے میں پوچھا کہ یہ کون ہے؟ راحت سنجیدہ ہو گیا۔ آہ لے کر اُس نے کہا ——— 'تمہیں معلوم ہے نا، میری بہن مر گئی تھی۔ اس سکھ لڑکی کو دیکھا تو میں سمجھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں اور میری بہن مجھے خواب میں ملنے آگئی ہے۔ اس لڑکی کے چہرے کی بڑی صاف جھلک اور باتیں کرنے کا انداز میری بہن جیسا ہے۔ پہلے یہ اپنے خاوند کے ساتھ آئی تھی آج

اکیلی آئی ہے۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ تم میری بہن کی تصویر ہو'...

"انسپکٹر صاحب! آپ نے راحت کی لاش دیکھی ہے۔ سُنا ہے کہ اُس کے چہرے پر بھی زخم تھے۔ اُس کے جسم سے سارا خون نکل گیا تھا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکے ہوں گے کہ راحت کتنا خوبصورت آدمی تھا۔ اس کے خیالات صاف تھے، نیّت صاف تھی، ضمیر صاف تھا، اس لیے اس کے چہرے پر بڑا ہی پیارا تاثر رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں ایسی تھیں، جیسے مسکرا رہی ہوں۔ ہمیں بعد میں راحت نے بتایا کہ سرجیت کور اس کے پاس آتی جاتی رہتی ہے۔ راحت خوش تھا۔ کہتا تھا سرجیت کور سے باتیں کر کے رُوح خوش ہو جاتی ہے......

"چار پانچ مہینے تو راحت خوش رہا۔ اس کے بعد ہم نے اسے پریشان دیکھا۔ کہنے لگے کہ سرجیت کور اس کی نیّت نہیں سمجھ سکی۔ وہ راحت کے جسم میں دلچسپی لیتی تھی۔ وہ دیہات میں جنی پلی سکھ لڑکی تھی۔ خدا نے اُسے حُسن تو دے دیا تھا اور وہ کسی اُونچے گھرانے کی شائستہ لڑکی لگتی تھی لیکن فطرت کے لحاظ سے وہ حیوان تھی۔ وہ اس اصول سے واقف ہی نہیں تھی کہ مرد اور عورت کی محبت پاک بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں نے سُنا ہے کہ اُس کا خاوند بوڑھا ہے" ——— میں نے کہا۔

"میں یہی آپ کو بتانے لگا تھا" ——— راحت کے اس دوست نے کہا ——— "راحت نے بتایا تھا کہ سرجیت کور کے خاوند کی عمر چالیس سال سے اُوپر ہے۔ سرجیت تیئس چوبیس سال کی ہے۔ اس کا خاوند فوجی سامان کی ٹھیکیداری میں اتنا امیر ہو گیا کہ اُس نے پُرانی بیوی کی چھٹی کرا دی اور سرجیت کور کو اُس کے ماں باپ سے خرید لیا۔ راحت نے بتایا تھا کہ یہ شخص ایک تو سکھ ہے، اس کی داڑھی آنکھوں کے قریب سے شروع ہوتی ہے اور دُور نیچے تک چلی جاتی ہے، اس کے علاوہ وہ بدصورت بھی ہے۔ سرجیت کور کو ڈاکٹر راحت مل گیا اور وہ اس پر فریفتہ ہو گئی۔ اب ڈاکٹر راحت اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن

وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی.....

"ہم نے راحت کو مشورہ دیا کہ وہ ہمت کرے اور آصفہ کو طلاق دے دے لیکن اس سے پہلے سرجیت کور کو مسلمان کرلے اور اس کے ساتھ شادی کرلے۔ تین چار روز بعد راحت نے ہمیں بتایا کہ اس نے سرجیت کور کے ساتھ بات کر لی ہے اور وہ تیار ہے لیکن راحت نے ہم سے یہ بھی کہا کہ وہ سرجیت کور کو ٹال رہا ہے۔ دراصل راحت اس کے ساتھ اس وجہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اسے اس لڑکی میں اپنی بہن کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس کا دل اس لڑکی کو بیوی کے روپ میں قبول کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ راحت کیا کرتا ہے۔ آج چوتھا دن چڑھا تو ہسپتال سے ایک ڈاکٹر نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ ڈاکٹر راحت کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے آئی ہے۔ میں نے اسے (دوست کو) اطلاع دی تو یہ کہنے لگا کہ اطلاع دینے والے ڈاکٹر نے مذاق کیا ہے۔ ہم ہسپتال گئے تو لاش راحت کی ہی تھی۔"

"آپ کا شک کیا ہے؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "کیا راحت کو سرجیت نے قتل کیا یا کرایا ہوگا؟ یا یہ کام سرجیت کے خاوند کا ہے؟"

"مجھے ذاتی طور پر ان دونوں پر شک ہے؟" ـــــ اس نے کہا۔

"میرا شک بھی یہی ہے" ـــــ دوسرے ڈاکٹر نے کہا ـــــ "لیکن آصفہ پر بھی شک ہے۔ انسپکٹر صاحب! میں ڈاکٹر ہوں۔ سائیکالوجسٹ تو نہیں ہوں لیکن نفسیاتی مریض کئی دیکھے ہیں۔ میں آصفہ کے نفسیاتی پہلو کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔"

"ہاں ڈاکٹر صاحب!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "مجھے یہ نفسیاتی مرض سمجھائیں۔ کیا یہ مرض اس نوعیت کا تھا کہ اس کے دورے میں اس عورت نے ڈاکٹر کو قتل کر دیا ہوگا؟"

"جی ہاں" ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ "اگر یہ مرض بگڑ گیا تھا تو یہ ہوسکتا ہے کہ آصفہ نے دورے کی کیفیت میں اپنے خاوند کو قتل کر

دیا ہو۔"

مجھے اچانک خیال آیا کہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ آصفہ جو مہندی کی تقریب کے بہانے عمران کے پاس چلی گئی تھی، جب واپس آئی تو اس نے دیکھا ہو کہ مقتول اکیلا بیٹھا شراب پی رہا ہے۔ آصفہ پر دورے کی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ اس آدمی کے پاس سے آئی تھی جسے وہ چاہتی تھی۔ اس نے شراب کی بوتل پکڑی اور ڈاکٹر راحت کو اسی سے مار ڈالا لیکن ٹیلیفون کی کٹی ہوئی تار اور دو گلاس مجھے پریشان کرتے تھے۔

گذشتہ رات بھی آئی تھی

میرے اس سوال کے جواب میں کہ آصفہ کا مرض کس نوعیت کا تھا ڈاکٹر نے ایک نفسیاتی بیماری کا نام لیا۔ MANIC DEPRESSION مجھے یاد رہ گیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے دو اور نام بھی لیے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس مرض کا دورہ اس طرح ہوتا ہے کہ اچانک مزاج میں بڑی سخت تبدیلی آجاتی ہے۔ اگر مریض پُرخلوص اور شگفتہ مزاج ہو تو وہ بغیر رکے بولنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے پتہ چلتا ہے جیسے وہ مجمع کے سامنے جوشیلی تقریر کر رہا ہو۔ گر مریض آصفہ جیسا ہو جس کے ذہن میں شکوے، ناکام خواہشیں اور اخلاقی پستی ہو تو وہ مرنے مارنے پر اتر آتا ہے۔ وہ بولتا کم ہے اور توڑ پھوڑ اور مار کٹائی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

مقتول کے ان دوستوں نے مجھے دلی کے دو ڈاکٹروں کے نام اور پتے بتائے جو ذہنی امراض کے ماہر تھے۔ آصفہ شادی سے پہلے بھی اُن کے زیرِ علاج رہی تھی۔ مقتول بھی شادی کے بعد اسے ان میں سے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا اور وہ اس کا علاج کرتا رہا تھا لیکن آصفہ کو کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ مقتول کے دوستوں نے مجھے بتایا کہ آصفہ کے ٹھیک ہونے کا امکان اس لیے بہت کم تھا کہ ڈاکٹر راحت سے اُسے نفرت

تھی اور وہ کسی اور کو چاہتی تھی جو اسے مل نہیں سکتا تھا۔

آصفہ کا یہ نفسیاتی مرض میرے کام کی چیز تھا۔ یہ خیال مجھے اُسی وقت آ گیا تھا کہ قاتل اگر آصفہ ہی ہوئی اور میں نے اُسے قاتل ثابت کر بھی دیا تو اسے سزا نہیں ملے گی۔ اس کا وکیل فوراً ان دونوں ڈاکٹروں کو کورٹ میں بلا کر کہلوا دے گا کہ یہ تو ذہنی مریضہ ہے اور اسے تھوڑی سی دیر کے لیے ایسا دورہ پڑتا ہے جس میں اسے اچھے اور بُرے کی تمیز نہیں رہتی۔ قانون میں یہ گنجائش ہے کہ پاگل پن INSANITY ثابت ہو جائے تو قاتل کو سزا نہیں ملتی کیونکہ اُسے اس کیفیت میں اپنے قول و فعل کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

میرا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ آصفہ کو ضرور سزا ملے۔ میرا مسئلہ تو یہ تھا کہ مجھے قاتل مل جائے اور میں اسے عدالت میں کھڑا کر دوں۔ مقتول کے ان دونوں دوستوں نے مجھے کچھ ایسی باتیں بتا دی تھیں جو مجھے تفتیش میں مدد دے سکتی تھیں۔

مقتول کے ان دوستوں نے ٹھیک کہا تھا کہ اس بے چارے کی میّت پر رونے والا بھی کوئی نہیں۔ کوٹھی میں ایک نوجوان آدمی کی لاش پڑی تھی جو کامیاب ڈاکٹر تھا۔ اس کی بیوہ بھی موجود تھی اور اس کے سسرال بھی آتے ہوتے تھے لیکن کوٹھی میں خاموشی تھی۔ اگر یہ کوئی اور گھر ہوتا یا یہ دیہات ہوتا تو اس قدر آہ و زاری، بَین اور سینہ کوبی ہوتی کہ اس کہرام میں میرا بیٹھنا محال ہو جاتا۔

جب یہ دونوں ڈاکٹر چلے گئے تو میں کھانے کے لیے کسی ہوٹل کی تلاش میں نکل گیا۔ ماتم والے گھر میں باہر سے کھانا منگوا کر کھانا مجھے معیوب سا لگتا تھا۔ میں جب کھانا کھا کر واپس آیا تو کمرے کے دروازے میں میرا اے ایس آئی کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت جوان بھی کھڑا تھا جسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ آصفہ کا امیرزادہ آشنا عمران ہے۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ عمران نے آگے ہو کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں

اُسے کمرے میں لے گیا۔

"حکم ملک صاحب!" — عمران نے کہا — "مجھے کیسے یاد فرمایا آپ نے؟"

"عمران صاحب!" — میں نے اُسے کہا — "ایک تصدیق کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔"

"زحمت نہ کہیے ملک صاحب!" — اُس نے دوستانہ لہجے میں کہا — "آپ نے اے۔ ایس۔ آئی کو بھیجا تھا، اپنے نوکر کو بھیج دیتے تو بھی میں حاضر ہو جاتا ..... کہیے، مجھ سے آپ نے کیسی تصدیق کرانی ہے؟"

"آپ کو معلوم ہے نا کہ ڈاکٹر راحت قتل ہو گیا ہے!" — میں نے کہا — "مقتول کی بیوی کہتی ہے کہ یہ واردات اُس کی غیر حاضری میں ہوئی ہے اور وہ آپ کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ کیا میں یہ صحیح مان لوں کہ وہ آپ کے ہاں ہی تھی؟"

وہ ہنس پڑا اور بولا — "جی ہاں۔ وہ میرے پاس ہی تھی۔"

"عمران بھائی!" — میں نے کہا — "میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ آپ مجھے کوئی غلط بات نہیں بتائیں گے۔ اگر آصفہ آپ کے ہاں نہیں گئی تھی تو مجھے بتا دیں۔ میں صرف آپ سے ہی تفتیش نہیں کر رہا۔ آصفہ کو جاننے والے کئی لوگوں سے سوال جواب کر چکا ہوں اور نہ جانے کتنے اور لوگوں کو بلاؤں گا اور کس کس کو شاملِ تفتیش کروں گا۔ آپ اُسے بچانے کی کوشش نہ کریں کیونکہ آپ کی یہ کوشش بُری طرح ناکام ہو گی۔"

"تو کیا آپ کو یہ شک ہے کہ قاتل آصفہ ہے؟" — عمران نے پوچھا۔

"نہ عمران بھائی!" میں نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا — "آپ مجھ سے سوال نہ پوچھیں۔ مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ آپ کی نوازش

ہو گی کہ میرے سوالوں کا جواب دیں۔"

مجھے اپنے آپ پر بڑا رحم آیا۔ میں فوجی خطّے کا رہنے والا آدمی اور ی میں، مجھے پُرتکلف اُردو بولنی پڑی۔ یں جب اس قسم کی اردو بولتا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں خاصا جاہل ہو گیا ہوں۔ عمران بھی لکھنؤ کا بانکا نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس شخص میں پنجابیت خاصی مقدار میں موجود ہے اور وہ مجھے متاثر کرنے کے لیے لکھنوی اُردو بول رہا تھا۔

"عمران بھائی!" ——— میں نے کہا ——— "مجھے ایک بات بتائیں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ مقتول سے پہلے آصفہ کا رشتہ آپ کے ساتھ طے ہوا تھا اور آصفہ کے باپ نے اسے مقتول کے ساتھ بیاہ دیا تھا؟"

عمران نے میرے منہ کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور بڑی پختہ آواز میں بولا ——— "ملک صاحب! میں زیادہ سوال و جواب کے سلسلے میں آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں آپ کو سیدھی بات بتا دیتا ہوں۔ آصفہ کا باپ اس کا رشتہ مجھے دے رہا تھا اور میں نے یہ رشتہ قبول کر بھی لیا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ لڑکی مجھے اچھی لگتی تھی اور یہ مجھے چاہتی بھی تھی بلکہ اسے آپ محبت کہہ لیں۔ مجھے پتہ چل گیا کہ لڑکی میں کوئی دماغی نقص ہے۔ میں نے اُس ڈاکٹر سے پوچھا جس سے اس کا علاج کرایا جا رہا تھا۔ وہاں سے مجھے پتہ چلا کہ اس کا یہ مرض خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ آصفہ مجھے اپنے باپ سے چوری ملا بھی کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس میں غرور اور تکبّر اتنا زیادہ ہے کہ مجھے شک ہوتا تھا کہ یہ مجھے چھوٹا سا آدمی سمجھتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ شوبازا اور بالکل کھوکھلی لڑکی ہے۔ میں نے اس کے باپ سے صاف کہہ دیا کہ میں اس کی بیٹی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔"

"لیکن عمران بھائی!" ——— میں نے کہا ——— "یہ تو دعویٰ کرتی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہو۔"

"آصفہ کو میرے سامنے بٹھائیں" ——— عمران نے کہا۔ "تاکہ میں

اُس کے سامنے بات کروں۔ اس سے آپ کو یقین ہو جائے گا کہ میں غلط بیانی نہیں کر رہا۔ یہ مجھے شادی کے بعد بھی ملتی رہی۔ مجھ پر زور دیتی تھی کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں۔ یہ مقتول سے طلاق لینے کی باتیں کرتی تھی۔ میں نے اس کی شادی کے فوراً بعد ایک اچھے گھرانے کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ آصفہ میرے پاس آتی رہی۔ میں نے ایک دن اسے ازراہِ مذاق کہا کہ تم میری بیوی بننا چاہتی ہو تو نکاح کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح مذاق مذاق میں میرا اس کے ساتھ قابلِ اعتراض تعلق پیدا ہو گیا۔ میرا خیال ہے یہ چاہتی ہی یہی تھی۔ گذشتہ رات بھی یہ اسی مقصد کے لیے میرے پاس آئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ خاوند کو یہ بتا کر آئی ہے کہ کسی کے ہاں مہندی کی رسم پر جا رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ملک صاحب! میں کہاں کا شریف آدمی ہوں۔ اللہ کا فضل ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ آصفہ جیسی کئی عورتیں آئیں اور کچھ دن موج میلہ کر کے میں نے انہیں چلتا کیا۔ اگر آپ کو یہ شک ہے کہ اس نے اپنے خاوند کو اس لیے قتل کیا ہے یا کروایا ہے کہ میں اس کے ساتھ شادی کروں گا تو آپ یہ وہم دل سے اُتار دیں۔ میں نے آپ کو جو باتیں بتائی ہیں ان کی آپ تصدیق بھی کر سکتے ہیں۔"

بیشک میں اس شخص کی شخصیت اور انداز سے متاثر ہوا تھا لیکن اس کے بیان کو میں سو فیصد سچ نہیں مان سکتا تھا۔ مجھے تصدیق تو کرنی ہی تھی۔ عمران کو میں نے فارغ کر دیا۔

بیوی نے زہر دیا ہے

ایک اور رات آگئی تھی۔ مقتول کو شام سے ذرا پہلے دفن کر دیا گیا تھا۔ قبرستان سے آ کر آصفہ اور اُس کا باپ میرے پاس آگئے۔ آصفہ کی آنکھیں خشک تھیں۔ اُس کے باپ کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اُس نے مجھ سے ایسے لہجے میں پوچھا کہ کچھ سراغ ملا ہے یا نہیں جیسے مجھ سے جواب طلبی

کررہا ہو۔ اُس نے کہا کہ ڈاکٹر راحت کی ناگہانی موت کا اُسے بہت غم ہے۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا کہ ڈاکٹر راحت کی موت کا نہیں اپنی بیٹی کا غم ہے کہ اب کون ہوگا جو اس کا رشتہ قبول کرے گا۔

رات کو میں نے تفتیش کے سلسلے میں کچھ اور کام کیا اور سوچتا رہا کہ اس وقت تک مجھے کیا حاصل ہوا ہے اور اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ یک بجے کے بعد میں وہیں سوگیا۔ صبح میں نے آصفہ اور اس کی نوکرانی نسیم کو ساتھ لیا اور تھانے چلا گیا۔ میں آصفہ کو گھیرنا چاہتا تھا۔ تھانے میں دو کام ایسے آگئے جو مجھے ہی کرنے تھے۔ میں ان میں مصروف ہوگیا اور گیارہ بجے کے قریب فارغ ہوا۔ میں اب آصفہ اور نسیم کی طرف توجّہ دینا چاہتا تھا لیکن ایک سکھ آگیا۔ میں نے اُسے بٹھایا اور پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے؟

"میری بیوی نے مجھے زہر دے دیا ہے" ـــــ اُس نے کہا اور دو تین کاغذ میرے آگے رکھ دیئے ـــــ "یہ ڈاکٹروں کی رپورٹیں ہیں"۔

میں نے رپورٹیں دیکھیں۔ ایک رپورٹ خون کے ٹیسٹ کی تھی، دوسری تھوک کے ٹیسٹ کی اور تیسری رپورٹ قے کی تھی۔ اُسے تین چار دنوں سے متلی محسوس ہو رہی تھی اور کسی وقت قے ہو جاتی تھی اور اس کی بھوک مرگئی تھی۔ وہ معدے اور جگر میں جلن محسوس کرتا تھا۔ تینوں رپورٹوں میں کسی زہریلے مادے کی موجودگی پائی گئی تھی اور خون میں اس کا بڑا صاف اثر دکھایا گیا تھا۔

"کیا آپ علاج کرا رہے ہیں؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "کل یہ رپورٹیں دیکھ کر مجھے ڈاکٹر نے ایک انجکشن دیا اور دوائیاں بھی دیں .... یہ اُس کا نسخہ ہے۔ دو ڈاکٹروں نے یہ رپورٹیں لکھی ہیں۔ دونوں نے کہا ہے کہ پولیس سٹیشن رپورٹ درج کرادو"۔ بولتے بولتے وہ گھبرا گیا۔ ڈرے اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا ـــــ "معلوم نہیں میرا کیا بنے گا۔ آپ میری رپورٹ لکھیں کہ مجھے بیوی نے زہر دیا ہے"۔

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو بیوی نے زہر دیا ہے؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"کیوں نہ میں آپ کو پورا بیان دے دوں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "پھر آپ مجھ سے جو کچھ پوچھنا چاہیں پوچھ لیں"۔

"ہاں ہاں!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "آپ مجھے ذرا ذرا سی بات بتائیں۔ میں رپورٹ لکھوں گا۔ آپ جس پر بھی شک کا اظہار کریں گے اُسے فوراً تھانے بلاؤں گا۔ پوری کارروائی کروں گا"۔

اُس نے جب بیان دیا تو میرے لیے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ میں اُس کا بیان اُسی کے الفاظ میں مختصر کرکے سناتا ہوں۔

"میں چھ سات دنوں سے محسوس کررہا تھا کہ میرے معدے میں جلن ہے" ـــــ اس نے کہا ـــــ "متلی سی بھی آتی تھی۔ جسم میں کمزوری بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اُس نے معدے کا السر بتایا اور کہا کہ شراب چھوڑ دو۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں۔ میں نے شراب چھوڑ دی لیکن تکلیف بڑھتی گئی .....

"ایک تو یہ رات گذری ہے، اس سے پہلی رات، کل رات کہہ لیں۔ میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میری بیوی کہیں گئی ہوئی تھی۔ میں نے فون کا ریسیور اٹھایا تو کسی آدمی نے اپنا نام بتائے بغیر کہا ـــــ 'سردار جی! آپ کو آپ کی بیوی زہر پلا چکی ہے۔ فوراً کسی ڈاکٹر ....' اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک عورت کی آواز آئی ـــــ 'تم دھوکہ باز۔ اُس بوڑھے مُردار کو بتا رہے ہو' ـــــ عورت کی آواز میں غصّہ تھا۔ پھر آدمی کی آواز آئی ـــــ 'میں یہ گناہ برداشت نہیں کرسکتا۔ تم پیچھے رہو۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ میں اُس کا علاج کروں گا' ـــــ پھر عورت کی آواز آئی جو پہلے سے زیادہ غصیلی تھی۔ 'میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی' ـــــ اور ٹیلیفون بند ہوگیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ دونوں لڑ رہے تھے ....

"میرے ذہن میں یہی الفاظ اٹک گئے کہ تمہاری بیوی تمہیں زہر پلا چکی ہے اور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ ..... یہ بھی ہوسکتا تھا کہ کسی نے مذاق کیا ہو لیکن عورت اور اس آدمی کی لڑائی نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ مجھے کوئی بیماری نہیں، یہ زہر کا اثر ہے اور زہر بیوی نے ہی دیا ہوگا۔"

"بیوی نے ہی کیوں دیا ہوگا؟" ——— میں نے پوچھا ——— "بیوی کے ساتھ اتنی زیادہ دشمنی ہے؟ آپ کی عمر پینتالیس سال ہوگی۔ بیوی کے ساتھ اتنی لمبی عمر گذار کر....."

"اتنی لمبی عمر جس کے ساتھ گذاری تھی، اُسے میں نے چھوڑ دیا ہے" ——— سکھ نے کہا ——— "ایک سال ہُوا ایک جوان لڑکی کے ساتھ شادی کر بیٹھا ہوں۔ مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔ بڑی شیطان لڑکی ہے۔"

"اُس کا نام مجھے بتا دیں" ——— میں نے کہا ——— "میں اُسے شک میں پکڑوں گا۔"

"سرجیت کور" ——— اُس نے اپنی بیوی کا نام بتایا۔

"سرجیت کور؟" ——— میرے مُنہ سے نکلا ——— "میں نے یہ نام سُنا ہے، اپنا ایڈریس دے دیں ..... کیا اُسے معلوم ہے کہ آپ پولیس سٹیشن آتے ہیں؟"

"اگر اُسے پتہ چل جاتا کہ میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں تو وہ چُھری سے میری انتڑیاں نکال دیتی" ——— اُس نے جواب دیا ——— "اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے ڈاکٹری ٹیسٹ کرائے ہیں۔"

آشنا آگیا

"اب آگے بتائیں" ——— میں نے کہا ——— "آپ کی بیوی کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔"

"وہ واپس آئی تو میں نے پُوچھا کہاں گئی تھی" ——— سکھ نے کہا ——— "اُس نے بتایا کہ ایک سہیلی کے گھر گئی تھی۔ وہ شراب کے نشے میں تھی۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی کہ سہیلی کے گھر گئی تھی۔ سہیلیاں شراب نہیں پلایا کرتیں۔ وہ کسی اور کے پاس گئی تھی۔ میں نے اُسے نہ بتایا کہ کوئی فون آیا تھا۔ وہ کپڑے بدل کر لیٹ گئی۔ میں ساری رات پریشان رہا۔ صبح پہلا کام یہ کیا کہ ڈاکٹر کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ اُس نے کہا کہ ابھی چلے جاؤ اور خون اور تھوک کا ٹیسٹ کرواؤ۔

اُس نے مجھے پرچی لکھ دی۔ اتفاق سے وہاں گیا تو مجھے متلی آئی۔ ٹیسٹ کرنے والے ڈاکٹر نے مجھے قے کروائی اور اس کا بھی ٹیسٹ کیا۔ کل شام کو اُس نے مجھے رپورٹیں دے دیں اور کہا کہ میں پولیس سٹیشن ضرور جاؤں۔"

اس سکھ ٹھیکیدار کا بیان سُن کر میرا دماغ بیک وقت دو وارداتیں سوچنے لگا۔ ایک ڈاکٹر راحت بیگ کا قتل اور دوسری واردات زہر خورانی کی جس کا شکار یہ سکھ ہُوا تھا۔ میرے ذہن میں سوال یہ اٹھا کہ یہ دونوں وارداتیں سرجیت کور کی ہیں یا اس سکھ کی سرجیت کور کوئی اور ہے؟

سکھ ٹھیکیدار کا کیس تو بہرحال رجسٹر کرنے والا تھا۔ ٹیسٹ صاف زہر خورانی بتا رہے تھے۔ یہ پرائیویٹ ڈاکٹر کے کئے ہوئے ٹیسٹ تھے۔ سکھ کو پولیس سرجن کے پاس بھیجنا تھا۔ میں نے یہ کیس اپنے تھانے کے دوسرے سب انسپکٹر کے حوالے کر دیا اور اُسے بتایا کہ میں سرجیت کور کو بُلا رہا ہوں۔

میں سرجیت کور کو ڈاکٹر کے قتل کے سلسلے میں شناخت کرانا چاہتا تھا۔ آصفہ اور نسیم تھانے میں موجود تھیں۔ وہ بڑی پریشانی کی حالت میں بیٹھی تھیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کسی سکھ لڑکی کو جانتی ہیں جو مقتول کی مریضہ تھی اور اُس کے پاس زیادہ دیر بیٹھی رہتی تھی؟

وہ نہیں جانتی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو تسلی دی اور معذرت کی کہ ان کا تھانے میں موجود رہنا ضروری ہے۔ انہیں میں نے عزت سے الگ

کمرے میں بٹھایا تھا۔ ایک کانسٹیبل کو بُلا کر کہا کہ اِن کے لیے اچھی قسم کی
چائے لے آئے۔ میں جب ان دونوں عورتوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا تو
مجھے ایسے لگا جیسے نسیم نے مجھے آنکھ سے اور سر کی ہلکی سی جنبش سے
اشارہ کیا ہے۔

میں نے اپنے دفتر میں آکر ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اُسے مقتول
کے ڈسپنسر کے گھر کا ایڈریس سمجھا کر کہا کہ اُسے فوراً تھانے بھیج دے۔
اس کے بعد اُسے سکھ ٹھیکیدار کے گھر کا پتہ سمجھایا اور کہا کہ اُس کی بیوی
کا نام سرجیت کور ہے، اُسے تانگے پر بٹھا کر تھانے لے آئے۔

میں نے نسیم کو بلایا اور پُوچھا کہ اُس نے مجھے کوئی اشارہ کیا تھا؟

"جی ہاں!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "میں صبح سے
بیگم آصفہ کے پاس بیٹھی ہوں اس نے بہت سی باتیں کی ہیں۔ میں
نے آپ کو پہلے بتا دیا تھا کہ میری ہمدردی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہے۔
خواہ وہ اِس دنیا سے اُٹھ ہی گئے ہیں۔"

اُس نے مجھے باتیں بتانی شروع کر دیں۔ ان میں یہی کچھ تھا کہ آصفہ
مقتول کو کوس رہی تھی۔ نسیم نے ایک بات یہ بتائی کہ گذشتہ رات ایک
جوان آدمی کوٹھی میں آیا تھا۔ وہ پہلے آپ کے پاس بیٹھا رہا تھا پھر آصفہ
کے پاس آیا۔ ڈاکٹر صاحب کو دفن کر آئے تھے۔ نسیم عمران کی بات
کر رہی تھی۔

"میرا خیال ہے یہی وہ آدمی ہے جسے بیگم چاہتی ہے" —— نسیم نے
کہا —— "اسی کی خاطر یہ عورت ڈاکٹر صاحب سے نفرت کرتی تھی میں
نے ہی اندر جا کر بیگم آصفہ کو اطلاع دی کہ عمران نام کے ایک صاحب آئے
ہیں۔ بیگم نے کہا —— وہ افسوس کے لیے آیا ہے اُسے پیچھے بھیج دو۔
پیچھے کا مطلب تھا پچھلے برآمدے میں۔ میں نے اُدھر دو کرسیاں رکھ دیں
اور عمران کو اُس طرف لے گئی۔ بیگم باہر نکلی تو رُونی سی صورت بنا کر کہا کہ
میں بیوہ ہو گئی ہوں ...

"میں اندر آگئی اور دروازے کے پیچھے چھپ کر اُن کی باتیں سننے
لگی۔ مجھے بھی شک تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو ان دونوں نے قتل کیا ہے
لیکن بات کچھ اور نکلی۔ آصفہ نے کہا، عمران! اب بتاؤ کیا ہوگا، میں تو
بیوہ ہو گئی ہوں۔ عمران نے کہا —— 'میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔
میں تمہارے پاس ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ مجھے پولیس نے
بلایا تھا۔ تھانیدار مجھے مشتبہ سمجھتا تھا۔ تم نے مشہور کر رکھا ہے کہ میری اور
تمہاری محبت شادی سے پہلے کی ہے اور دونوں شادی کرنا چاہتے تھے
لیکن تمہارے ابا نے ہماری شادی نہ ہونے دی۔ تمہارے اس جھوٹ کا
نتیجہ یہ ہے کہ مجھے پولیس نے اس شبہے میں بلایا تھا کہ میں نے تمہارے
خاوند کو تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لیے قتل کیا ہے۔ یہ تو کوئی اچھا
انسپکٹر ہے جس نے میرے ساتھ عزت سے بات کی ہے اور میری بات
سمجھ گیا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو میرے ساتھ ملزموں جیسا سلوک کرتا ...

"بیگم آصفہ بہت تڑپی۔ اُس نے کہا کہ مجھے خود معلوم نہیں کہ میرے
خاوند کو کون قتل کر گیا ہے، میں نے تمہارے متعلق کوئی بات نہیں
کی۔ عمران اُس پر برس پڑا۔ کہنے لگا —— 'تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم نے انسپکٹر
کو بتایا تھا کہ تم میرے پاس تھیں اور یہ بھی کہ تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی
تھیں۔ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا تو پہلے کر لیتا۔ تم جانتی ہو کہ میں
نے تمہیں قبول نہیں کیا تھا۔ میں نے ایک معزز گھرانے میں شادی کر لی اور
تم نے میرے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر لیے۔ اب میں تمہارے ساتھ یہ
تعلقات بھی نہیں رکھوں گا۔ تم اتنے شریف اور مخلص خاوند کو دھوکہ دینے
والی نہ جانے اور کس کس کے پاس جاتی ہو' —— عمران اُٹھ کھڑا ہوا اور
چلا گیا۔ میں وہاں سے ہٹ آئی۔"

نسیم کی اس رپورٹ سے مجھے یقین ہو گیا کہ اس قتل میں عمران شامل
نہیں۔ آصفہ کے خلاف ابھی شک باقی تھا۔

چہرہ حسین مگر پاکیزگی نہیں

ڈسپنسر نے آتے آتے ڈیڑھ گھنٹہ لگا دیا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ باہر کہیں بیٹھ جائے۔ سرجیت کور آئے گی۔ اُسے دیکھ کر مجھے بتائے کہ یہ وہی سکھ لڑکی ہے جو مقتول کے پاس آیا کرتی تھی؟

سرجیت کور بھی آ گئی۔ وہ واقعی خوبصورت تھی لیکن اُس کے چہرے کی ہلکی ہلکی سُرخی اور چہرے کا تاثر بتاتا تھا کہ اس میں پاکیزگی اور پاکیزہ خیالی ہو ہی نہیں سکتی۔ اُسے میرے دفتر میں داخل کر دیا گیا۔ میں نے اُسے بٹھایا اور خود باہر نکل گیا۔ ڈسپنسر نے کہا کہ یہی ہے۔ میں نے دفتر میں آ کر سرجیت کور کی کلائیاں دیکھیں۔ اُس کی چوڑیوں کا رنگ اور ڈیزائن وہی تھا جو اُن ٹکڑوں کا تھا جو مجھے مقتول کی لاش کے قریب پڑے ملے تھے۔

"سرجیت!" ——— میں نے کہا ——— "تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ تمہارا ڈاکٹر راحت بیگ قتل ہو گیا ہے۔ تم نے اخبار میں بھی پڑھا ہو گا۔"

"آپ نے اُسے میرا ڈاکٹر کیوں کہا ہے؟" ——— اُس نے کہا۔ "میں ایک دو بار ہی اُس کے پاس گئی ہوں گی۔"

"تم نے باہر ڈاکٹر کے ڈسپنسر کو کھڑے نہیں دیکھا؟" ——— میں نے پوچھا ——— "کیا اُسے تمہارے سامنے کھڑا کر کے پُوچھوں کہ تم کتنی بار ڈاکٹر راحت کے پاس گئی تھیں؟"

اُس نے میرے مُنہ پر نظریں جما لیں اور اس کی آنکھیں کھُل گئیں، پھر کھُلی ہی رہیں۔

"کیا تم نے ڈاکٹر کی خاطر اپنے خاوند کو زہر دیا ہے؟" ——— میں نے اُس کی طرف جھک کر پوچھا۔

اُس پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے ہلایا تو اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس کا یہ جرم تو صاف نظر

آ رہا تھا کہ اُس نے اپنے خاوند کو زہر دیا ہے جس کا خاوند کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ مجھے اُس کی اس واردات کا ذرا سا بھی خیال نہ تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ قتل کی رات مقتول کے پاس یہی عورت تھی یا کوئی اور تھی۔ قاتل تو کوئی مرد ہی ہو گا لیکن مجھے شک تھا کہ یہ وہاں موجود تھی۔

"نہیں بولو گی تو تمہیں پریشانی ہو گی" ——— میں نے کہا ——— "میرے ساتھ تعاون کرو گی تو میں تمہاری عزت کروں گا۔ میں نے تمہیں کسی شک پر نہیں بلایا۔ میرے پاس ثبوت ہیں۔ میرے سوا تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔"

اب اُس نے میرے منہ کی طرف دیکھا تو اُس کے ہونٹوں میں ایسی جنبش ہوئی جیسے وہ مسکرانا چاہتی ہو۔

"مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو" ——— میں نے پوچھا ——— "تم نے یہ کیوں کہا ہے کہ ڈاکٹر کے پاس تم ایک دو بار ہی گئی تھیں۔ وہ تمہیں کبھی کبھی جس ہوٹل میں لے جایا کرتا تھا، اُس ہوٹل کے بیرے تمہارے خلاف گواہی دیں گے" ——— میں نے اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکالنے کے لیے جھوٹ بولا ——— "میں تمہیں ایک ڈائری دکھاؤں گا جس پر ڈاکٹر راحت کے ساتھ تمہاری ہر ایک ملاقات کا دن بھی اور وقت بھی لکھا ہو گا۔"

اُس نے سر جھکا لیا۔

"ایک سوال اور ہے" ——— میں نے کہا ——— "تم نے اُس رات شراب کہاں پی تھی؟ تم شام کے بعد گھر سے نکل گئی تھیں اور رات کو شراب کے نشے میں مست گھر گئی تھیں۔ کہاں گئی تھیں؟ کسی جگہ کا نام لو، میں وہاں سے تصدیق کراؤں گا۔ سچ بولو گی تو فائدے میں رہو گی۔"

وہ بول نہیں رہی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ سوچ لے اور کچھ وقت بعد جواب دے۔ میں باہر نکل گیا اور اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ سرجیت کور کی انگلیوں کے نشان لے لے۔ اے۔ ایس۔ آئی اُسی وقت اپنا سامان اُٹھا کر میرے دفتر میں چلا گیا۔ میں آصف اور نسیم کے پاس چلا گیا۔ اُن کے

ساتھ تسلی تشفی کی دو تین باتیں کیں اور نسیم کو اشارہ کیا کہ باہر آ جائے۔
میں برآمدے میں آیا تو نسیم باہر آ گئی۔ میں کانسٹیبلوں کے کمرے میں چلا گیا اور نسیم کو چارپائی پر بٹھا لیا۔

"دیکھو نسیم!" ــــ میں نے کہا ــــ "تم نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر کی بیوی جب کبھی کہیں چلی جاتی تھی، ڈاکٹر تمہیں روک لیتا تھا۔ قتل کی رات آصفہ مہندی کی تقریب میں چلی گئی تھی۔ کیا ڈاکٹر نے تمہیں گھر جانے سے روکا نہیں تھا؟"

"نہیں" ــــ نسیم نے جواب دیا ــــ "میں ایسے موقعوں پر خود ہی رُک جایا کرتی تھی۔ اب بھی مجھے یہی توقع تھی کہ ڈاکٹر صاحب چاہیں گے کہ میں اُن کی خاطر رُکی رہوں لیکن انہوں نے کہا کہ آج میرے مہمان آ رہے ہیں۔ تم چلی جاؤ۔"

"ایک بات اور بتاؤ" ــــ میں نے پوچھا ــــ "ڈاکٹر شراب پیتا تھا۔ کیا وہ تمہیں پاس بٹھا کر بھی شراب پیا کرتا تھا؟"

"نہیں" ــــ نسیم نے جواب دیا ــــ "میری موجودگی میں انہوں نے شراب کبھی نہیں پی تھی۔ میں تو انہیں شراب سے روکا کرتی تھی لیکن وہ کہتے تھے کہ میں نشے کی خاطر نہیں پیتا بلکہ اپنے آپ کو گم کر دینے کی خاطر پیتا ہوں۔"

میں نے نسیم کو آصفہ کے پاس بیٹھنے کے لیے بھیج دیا اور خود باہر آیا۔ اے۔ ایس۔ آئی سرجیت کور کی انگلیوں کے نشان لے آیا تھا۔

"ملک صاحب!" ــــ اے۔ ایس۔ آئی نے کہا ــــ "اس عورت کو ڈھیلا نہ چھوڑنا۔ میں اُس کی انگلیوں کے نشان لینے لگا تو اس نے دانستہ اپنا گال میرے گال سے لگا دیا اور پوچھنے لگی کہ یہ نشان کیوں لے رہے ہو۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ نشان تمہیں سیدھا کالا پانی لے جا رہے ہیں۔" اس نے فوراً اپنا منہ پرے کر لیا۔ میں نے اُسے کہا کہ ڈرو مت، تم نے آخر جرم ہی ایسا کیا ہے جو تمہیں بُرے انجام تک پہنچائے گا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے

دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور کہنے لگی کہ میں اپنے تمام زیورات اور جتنی رقم تم مانگو گے، دے دوں گی۔ میں اپنا آپ بھی تمہارے حوالے کر دوں گی، مجھے تھانے سے نکلواؤ۔ میں نے اُسے کہا کہ بڑے تھانیدار جو کچھ پوچھیں وہ ٹھیک ٹھیک بتا دو، پھر میں اُن کے ساتھ بات کر کے تمہارا سودا کرا دوں گا۔ وہ تمہاری بچت کی صورت نکال لیں گے۔"

میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل، دونوں گلاسوں، ٹیلیفون سیٹ اور ریسیور ساتھ لے کر اور ان تینوں عورتوں کی انگلیوں کے نشانات والے کاغذات لے کر ڈی۔ ایس۔ پی کے پاس چلا جائے اور اُس سے چھٹی لے کر کسی ہیڈ کانسٹیبل کو آج ہی پھلور بھیج دے۔ پھلور میں فنگر پرنٹ بیورو تھا جہاں انگلیوں کے نشانات دیکھے اور ملائے جاتے تھے۔

نشہ شراب کا اور جوانی کا

میں دفتر میں چلا گیا اور سرجیت کور کے سامنے بیٹھ گیا۔

"تم نے جو بات چھوٹے تھانیدار سے کی ہے وہ میرے ساتھ کر لیتیں" ــــ میں نے کہا ــــ "تمہاری بچت کی صورت نکالنا بہت ہی مشکل ہے۔"

"مجھ پر رحم کریں اور کوئی صورت نکالیں" ــــ سرجیت کور نے کہا ــــ "میں نے اس تھانیدار سے جو وعدہ کیا ہے وہ آپ جس وقت چاہیں، میں پورا کر دوں گی۔"

رشوت پیش کرنے کا مطلب اقبالِ جرم ہوتا ہے۔ سرجیت کور چالاک اور ہوشیار ہو سکتی تھی لیکن تھانہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں جرائم پیشہ لوگ بھی آ کر گھبرا جاتے ہیں۔ مجھے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ڈاکٹر کو قتل کس نے کیا ہے۔ مجھے یہ یقین ضرور تھا کہ قتل کا باعث یہی لڑکی ہے اور یہ قتل کی عینی شاہد ہے۔ اگر جرم کے ساتھ اس کا تعلق نہ ہوتا تو یہ اتنی زیادہ رشوت پیش نہ کرتی۔ قتل کرنے کے لیے تو بڑے ہی مضبوط دل گردے کی ضرورت ہے۔ قتل ہوتے دیکھنا بھی کوئی کوئی برداشت کر سکتا

ہے۔ سرجیت کور کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ وہ باعصمت عورت نہیں تھی۔ لیکن میرا اے۔ایس۔آئی اُسے بتا چکا تھا کہ اُس کا انجام کیا ہوگا۔ اُس کا رنگ پیلا اور آنکھیں سفید ہو چکی تھیں۔ اُس کے ہونٹ بھی جن کا رنگ گلابی تھا، خشک ہو کر کچھ کچھ سفید ہو چکے تھے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ مجھے پوری بات سُنا دے تاکہ میں اُس کے مطابق اُس کے لیے گنجائش نکالنے کی کوشش کروں۔

اُس نے پہلے تو دو تین لمبے لمبے سانس لیے پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر اُس نے میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی یہ حرکتیں میرے لیے نئی نہیں تھیں۔ ہر ملزم اقبالِ جُرم سے پہلے اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو پانے کے لیے اسی قسم کی حرکتیں کرتا ہے ــــ پہلے وہ رُک رُک کر بولی۔ پھر میری حوصلہ افزائی سے وہ کھُل کر بولنے لگی اور جب اُس کے جذبات میں گرمی آئی تو وہ احتجاج کے جوشیلے لہجے میں بولنے لگی۔ اُس کے جذبات کا بھڑکنا قدرتی امر تھا کیونکہ اُسے ایک بوڑھے اور بدصورت سکھ کے ساتھ بیاہ دیا گیا تھا۔ میں اُس کا بیان اپنے الفاظ میں ذرا اختصار سے پیش کرتا ہوں۔

اُس نے اپنے جُرم کا جواز پیش کرنے کے لئے بڑی لمبی بات شروع کر دی لیکن میں نے اُسے کہا کہ سب سے پہلے وہ صاف الفاظ میں یہ بتائے کہ اُس نے کیا جُرم کیا ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی بہت سی باتیں کی تھیں۔ اُسے اس وقت ہمدردی ہی کی ضرورت تھی۔ وہ ڈوب رہی تھی اور روائتی تنکے کا سہارا تلاش کر رہی تھی۔

"ڈاکٹر راحت کو میں نے قتل کیا ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "لیکن نشے اور غصے کی حالت میں .... میں اُسے قتل کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

اُس نے شاید اور کچھ بھی کہا ہوگا لیکن مجھے آج بھی یاد ہے کہ اُس کا یہ اعتراف سُن کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے بڑی زور کا بھونچال آیا

ہو۔ بخدا دو چار سیکنڈ کے لیے تو میں سُن ہو گیا۔ کسی وقت بھی مجھے یہ خیال نہ آیا تھا کہ قاتل یہ لڑکی یا کوئی اور عورت ہو سکتی ہے۔

سرجیت کور نے اپنا دوسرا جرم یہ بتایا کہ اُس نے اپنے خاوند کو شراب میں زہر ملا کر پلایا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی پچھلی ہسٹری سنانی شروع کر دی۔ اُس نے بڑے صاف الفاظ میں ہر ایک بات سُنائی۔

دیہات کے سکھوں میں شرم و حجاب ہوتا ہی نہیں۔ جوان بہو بیٹیوں کے سامنے بھی گالیاں بکتے رہتے ہیں۔ دیہاتی سکھوں میں یہ رواج شاید آج بھی موجود ہوگا۔ اُس زمانے میں تو اس رواج کا وہ بڑے فخر سے ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک بھائی کی شادی ہو جاتی تو اس کے دوسرے بھائی بھاوج کو اپنی بیوی بنا لیتے تھے۔ یہ ذلیل حرکت کھُلے بندوں ہوتی تھی۔ دوسرا رواج یہ تھا کہ سکھ اپنی سالیوں کو بھی جائز سمجھتے تھے اور ان کی بیویاں خوش ہوتی تھیں کہ اُن کے خاوند اُن کی بہنوں کو اتنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

سرجیت کور نے بتایا کہ اُس کی عمر چودہ سال تھی جب اُس کی بہن کی شادی ہوئی تھی۔ اس کے بہنوئی نے اس کی بڑی بہن کے ایما پر اسی عمر میں ہی اُسے بے آبرو کر دیا لیکن لڑکی چونکہ سکھوں کی لڑکی تھی اس لیے بے آبروئی میں اُس نے اپنی آبرو سمجھی۔ اس کے بعد سرجیت کور نے بدکاری کو ہی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ جب یہ شادی کی عمر کو پہنچی تو اُسے اس ٹھیکیدار کے ساتھ بیاہ دیا گیا جس کی عمر پینتالیس سال تھی اور جو بدصورت بھی تھا۔ ٹھیکیدار نے اپنا کاروبار دِلّی میں آ کر شروع کیا تھا۔ ایک سال کے اندر اندر اُس کے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی تھی جو اس سے سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ اُس نے گاؤں میں جا کر سرجیت کور کو خرید لیا۔ شادی باقاعدہ ہوئی تھی۔

سرجیت کور نے پہلے روز ہی اپنے خاوند کو دھتکار دیا۔ اُس نے چند مہینے روتے گذار دیئے۔ پھر اس کی ملاقات ڈاکٹر راحت بیگ سے ہو گئی۔ یہ میں آپ کو دوسروں کی زبانی سُنا چکا ہوں کہ ڈاکٹر راحت اُسے کس نظر سے دیکھ رہا تھا۔ سرجیت کور نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر پاکیزہ محبت کا خواہاں تھا لیکن اُس

کھ لڑکی کے ذہن میں مرد اور عورت کی محبت کا تصور بڑا ہی گھناؤنا تھا۔

سرجیت کور نے اپنے طویل بیان میں مجھے بتایا کہ اُس نے ڈاکٹر راحت بیگ سے کئی بار کہا کہ وہ جسمانی تعلق چاہتی ہے، لیکن ڈاکٹر راحت عجیب آدمی تھا جو اتنی خوبصورت لڑکی کی یہ پیشکش ٹھکراتا رہا۔ آخر ایک روز ڈاکٹر راحت نے اُسے کہا کہ وہ اپنے خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے اور ڈاکٹر اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔ یہ تو مجھے مقتول کے دو دوستوں نے بتایا تھا کہ مقتول نے سرجیت کور کو محض ٹالا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ سرجیت کور خاوند سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے گی۔ سرجیت کور نے مجھے بتایا کہ وہ سمجھتی رہی کہ ڈاکٹر راحت اس معاملے میں سنجیدہ اور پُرعزم ہے

سرجیت کور نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ اُسے چھوڑ دے۔ اُس وقت تک یہ لڑکی اس بوڑھے سکھ پر چھا چکی تھی۔ وہ اس کے سامنے دبا دبا رہتا تھا لیکن سرجیت کور نے اُس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جب بات کی تو بوڑھا جوش میں آ گیا۔ اُس نے اُسے صاف کہہ دیا کہ اُس نے سرجیت کور کے باپ کو پچیس ہزار روپیہ نقد دیا تھا اور اُس کے باپ نے ساہوکار سے جو پانچ ہزار روپیہ لے رکھا تھا وہ بھی اُس سکھ نے ادا کیا تھا۔ خاوند نے سرجیت کور سے کہا کہ اُس نے اُسے خریدا ہے۔ اگر سرجیت کور نے علیحدگی کی بات کی تو اس کا گلا گھونٹ کر جمنا میں پھینک آئے گا۔

سرجیت کور نے شادی کے فوراً بعد اپنے جیسی ایک سہیلی سے تھوڑا سا زہر لیا تھا جس سے وہ خودکشی کرنا چاہتی تھی لیکن اس میں مرنے کی جرأت پیدا نہ ہوئی۔ یہ زہر اُس کے پاس محفوظ پڑا تھا۔ سرجیت کور نے مجھے بتایا کہ اس زہر میں یہ خوبی تھی کہ اس سے آدمی فوراً نہیں مرتا بلکہ یہ آہستہ آہستہ اثر کرتا ہے اور مرتے مرتے دس بارہ دن لگ جاتے ہیں۔

سرجیت کور نے اپنے خاوند کی شراب کی بوتل میں یہ زہر ملا دیا۔ رات کو خاوند شراب کے ساتھ زہر پی گیا۔ تیسرے دن خاوند نے اس کے اثرات محسوس کرنے شروع کر دیئے جنہیں وہ معدے کی بیماری سمجھتا رہا۔ جب یہ اثرات

اوصاف ہو کر سامنے آئے تو سرجیت کور نے ڈاکٹر راحت سے ملنے کی ضرورت محسوس کی۔ موت جب آتی ہے تو حالات از خود پیدا ہو جاتے ہیں اور بند راستے بھی کھل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر راحت کو سرجیت کور کے گھر کا ٹیلیفون نمبر معلوم تھا۔ اُس نے سرجیت کور کو فون کیا اور کہا کہ آج رات اُس کی بیوی اپنے کسی رشتہ دار کی مہندی کی رسم پر جا رہی ہے۔ اُس نے سرجیت کور سے کہا کہ رات ساڑھے آٹھ سے ذرا بعد اس کے گھر آ جائے۔

سرجیت کور آ گئی۔ آصفہ جا چکی تھی۔ ڈاکٹر راحت نے شراب کی بوتل نکالی اور دو گلاس تپائی پر رکھ دیئے۔ دونوں پینے لگے۔ سرجیت کور نے مجھے بڑی بے حیائی سے بتایا کہ شراب کے نشے نے اس پر شیطان سوار کر دیا تھا۔ اُس نے مقتول سے کہا کہ اُن کی شادی تو ہوتی رہے گی لیکن وہ شبِ عروسی آج ہی منانا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر راحت نے پہلی بار اس پر انکشاف کیا کہ وہ اُسے اپنی بہن کی تصویر سمجھتا ہے اور وہ اُس کے جسم کے ساتھ کوئی تعلق رکھ ہی نہیں سکتا۔

سرجیت کور پہ ایک تو شراب کا نشہ تھا، دوسرے جذبات کی حیوانیت تھی اور اُسے مزید بھڑکانے کا باعث یہ بنا کہ مقتول نے اُسے کہہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کر ہی نہیں سکتا۔ سرجیت کور نے اُسے بتایا کہ وہ اُس کے وعدے پر اپنے خاوند کو زہر دے چکی ہے جس کا اثر شروع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر راحت بیگ نے جب یہ سنا تو تڑپ اُٹھا۔ اُس نے سرجیت کور سے کہا کہ اپنے جذبات کی خاطر وہ کسی انسان کو مرنے نہیں دے گا۔ سرجیت کور نے سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اُس کے خاوند کی یہی سزا ہے کہ اُسے زندہ نہ رہنے دیا جاتے لیکن ڈاکٹر راحت نے اُسے کہا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر انسانوں کو موت سے بچایا کرتا ہے، اُن کی موت کا بندوبست نہیں کیا کرتا۔ ڈاکٹر اُٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سرجیت کور کو اُس کمرے سے جب آواز سنائی دی ——— "ہیلو ...ان بول رہا ہے" ——— تو سرجیت کور گھبرا گئی کہ ڈاکٹر پولیس سٹیشن یا اُس کے خاوند کو فون کر رہا ہے۔ وہ اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے دیکھا کہ ڈاکٹر کسی کو فون کر رہا تھا ——— "سردار جی! آپ کی بیوی آپ کو زہر

دے چکی ہے"۔۔۔۔ سرجیت کور ڈاکٹر پر جھپٹ پڑی اور اُن کے درمیان وہ مکالمے ہوئے جو میں آپ کو سرجیت کور کے خاوند کی زبانی سُنا چکا ہوں۔ ٹیلیفون بند نہیں ہوا تھا۔ اُن کے مکالمے سرجیت کور کا خاوند سُن رہا تھا۔ یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ سکھ ٹھیکیدار کو معلوم نہیں تھا کہ کون بول رہا ہے۔

میں نے سرجیت کور سے کہا کہ اُسے شاید معلوم نہیں کہ وہ جو باتیں ڈاکٹر راحت سے کر رہی تھی وہ اُس کا خاوند سُن رہا تھا۔ یہ باتیں سُن کر ہی وہ اگلی صبح ایک ڈاکٹر کے پاس چلا گیا تھا۔ سرجیت کور نے مجھ سے پوچھا کہ اُس کا خاوند تھانے آیا تھا؟ میں نے اُسے بتایا کہ وہ ڈاکٹری رپورٹیں تھانے میں دے کر باقاعدہ کیس درج کرا گیا ہے۔ میں نے سرجیت کور کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے اُسے کہا کہ وہ فکر نہ کرے، میں اُس کا یہ جُرم ثابت نہیں ہونے دُوں گا۔

سرجیت کور نے بتایا کہ ڈاکٹر راحت فون نہیں چھوڑ رہا تھا۔ سرجیت کور نے اُس کے ہاتھ سے ریسیور چھیننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے سیٹ کو پکڑ لیا۔ اور اتنی زور سے کھینچا کہ تار سیٹ سے الگ ہو گئی۔ ڈاکٹر راحت اُسی کمرے میں آ گیا جہاں وہ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ سرجیت کور نے اُسے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی کہ اُس بوڑھے کو مر جانے دو اور وہ مسلمان ہو کر ڈاکٹر کی بیوی بن جائے گی لیکن ڈاکٹر راحت نے اُسے ایسی باتیں کہہ دیں جو وہ برداشت نہ کر سکی۔ ڈاکٹر راحت نے اُسے کہا کہ تم سے میری نوکرانی اچھی ہے جسے اپنی عزّت عزیز ہے۔ ڈاکٹر راحت نے یہ بھی کہا کہ اُسے اگر دوسری شادی کرنی ہی پڑی تو وہ اپنی نوکرانی کے ساتھ شادی کرے گا سرجیت کور کے ساتھ نہیں کرے گا۔

سرجیت کور پر شراب کا اور اپنی جوانی کا نشہ طاری تھا۔ اُس نے ڈاکٹر کو ویسے ہی دو ضربیں لگانے کے لیے شراب کی بوتل پکڑ لی اور پوری طاقت سے اُس کے سر پر بوتل کی تین چار ضربیں لگائیں۔ بوتل ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر اُٹھا۔ سرجیت کور

نے ٹوٹی ہوئی بوتل کا ٹکڑا خنجر کی طرح ڈاکٹر کے مُنہ پر مارا۔ ڈاکٹر فرش پر گر پڑا۔ سرجیت کور نے مجھے بتایا کہ اُس وقت وہ پاگل ہو گئی تھی۔ جب ڈاکٹر فرش پر گر پڑا تو سرجیت کور نے اس کے سینے پر آخری وار کیا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ بوتل کا جو ٹکڑا سرجیت کور کے ہاتھ میں تھا وہ تین پھلوں والا خنجر بن گیا تھا۔ سرجیت کور نے یہ ٹکڑا خنجر کی طرح ڈاکٹر کے سینے پر مارا۔ سرجیت کور نے یہ نہ دیکھا کہ ڈاکٹر زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ وہ نشے اور غصّے میں وہاں سے چلی گئی۔ صبح اُس کی آنکھ کھُلی تو اُسے رات کا واقعہ اس طرح یاد آیا جیسے اُس نے ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ اُسے یکلخت یاد آیا کہ رات کو وہ کیا کر آئی ہے۔ اُس نے اپنے وہ کپڑے دیکھے جو رات کو اُس نے پہن رکھے تھے۔ شلوار کے صرف پائنچے پر خون کے دو تین چھوٹے چھوٹے داغ تھے۔ جب اس کا خاوند اپنے کام پر نکل گیا تو اُس نے ڈاکٹر راحت کے گھر ٹیلیفون کیا لیکن ادھر سے کوئی جواب نہ ملا۔ اسے یاد آیا کہ ٹیلیفون اور ریسیور کی تار کٹ گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر راحت کے کلینک کو چلی گئی۔ کلینک بند تھا۔ اُس نے ساتھ والے دکاندار سے پوچھا کہ یہ کلینک کتنے بجے کھلتا ہے۔ دکاندار نے اُسے بڑے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سُنا ہے ڈاکٹر صاحب رات کو گھر میں قتل ہو گئے ہیں۔

سرجیت کور اس قدر بے چین ہو گئی کہ اس نے خودکشی تک کا ارادہ کر لیا۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ اپنے گاؤں بھاگ جائے۔ وہ اکیلی روتی بھی رہی۔ اگلے روز اخباروں میں اس نے ڈاکٹر راحت کے قتل کی خبر پڑھی۔ اس سے تھوڑی دیر بعد میرا کانسٹیبل اُسے بلانے پہنچ گیا۔

اس کے بعد جو کہانی ہے وہ پولیس اور عدالت کی کارروائیاں ہیں جو میں نے بڑی استادی سے۔ سرجیت کور کا بیان مجسٹریٹ سے قلمبند کروا لیا جس میں اس کے خاوند کی زہر خورانی کا کیس بھی شامل تھا۔ کیس جب عدالت میں گیا تو معمولی سا وکیل سرجیت کور کی صفائی کے لیے آیا۔ ڈاکٹر کا قتل ثابت ہو گیا۔ لیکن یہ ثابت نہ کیا جا سکا کہ سرجیت کور کے خاوند کو ہو... مر دیا گیا تھا وہ سرجیت کور نے دیا تھا۔ ڈاکٹر کے قتل میں سرجیت کور کو سزائے عمر قید دی گئی۔